ایک عورت ہزار دیوانے

کرشن چندر

جملہ حقوق اشاعت محفوظ ہیں

نام کتاب ــــــــ ایک عورت ہزار دیوانے

مصنف ــــــــ کرشن چندر

کتابت ــــــــ محمد عارف سہسوانی

سن اشاعت ــــــــ سنہ ۱۹۹۷ء

مطبوعہ ــــــــ فوٹو آفسیٹ پرنٹرس دہلی

قیمت ــــــــ ۱۵۰ روپے

ISBN 81-86849-07-6

ناشر

ایشیا پبلیشر

اے ۳۶ ۔ چیتک اپارٹمنٹس ۔

پلاٹ نمبر ۲/۲۷ ۔ سیکٹر ۹

روہنی نئی دہلی ۸۵

ایک عورت ہزار دیوانے

کرشن چندر

کرشن چندر

پیدائش: ۲۳ نومبر ۱۹۱۳ء ——— وفات: ۸ مارچ ۱۹۷۷ء

Ek Aurat Hazaar Deewane

by

Krishan Chander

Price :- 150/-

Asia Publisher's
A-36, Chetak Apartments
Plot No. 27/2 Sector-9
Rohini, Delhi-110085
Tel :- 7261823
ISBN 81-86849-07-6

میں نے اس ناول کا مواد بھی زندگی سے اکٹھا کیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک حسین خانہ بدوش لڑکی لاچی ہے۔ جس کا قبیلہ آج اس بیسویں صدی میں بھی ہزاروں برس پُرانی زندگی کی ڈگر پر چل رہا ہے۔ بمبئی کے مضافاتی اسٹیشنوں کے اردگرد اکثر ایسے خانہ بدوش قبیلے آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور اپنی عجیب اور دلچسپ زندگی سے کچھ دنوں کے لئے فضا کو رنگین بنا جاتے ہیں۔ یہ ناول ایک ایسے ہی خانہ بدوش قبیلے اور اس قبیلے کی ایک بہادر لڑکی کی داستان ہے جو ہر قدم پر زندگی کی عظمت کا ثبوت پیش کرتی ہے

کرشن چندر

۳۰ر مارچ ۱۹۶۰ء

پہلا باب

اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں ایک ہنگامہ تھا۔ قلی، کلیان کی گاڑی پکڑنے والے مسافر، ٹکٹ چیکر، اسٹیشن کے باہر پھل بیچنے والا، مادھو یارڈ میں گشت کرنے والے سنتری، جھاڑو پھیرنے والا جمعدار سبھی موجود تھے۔ لاچی کی طرف دیکھ کے ہنس رہے تھے۔ اور لاچی سب سے الگ تھلگ اسٹیشن ماسٹر کی میز کے سامنے اپنے دونوں کولھوں پر بڑی بے شرمی اور بے حیائی سے اپنے دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ اور اس کے چہرے پر ایسا غصہ تھا جیسے ابھی سب کو کچا کھا جائے گی۔ مگر اس وقت وہ دشمنوں کے نرغے میں بے بس کھڑی تھی۔ اور اسٹیشن کے لوگ جو اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کی طرف دیکھ دیکھ کے ہنس رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کو اشاروں ہی اشاروں میں کچھ سمجھا رہے تھے۔

یارڈ سنتری جب لاچی کو لئے پہلے پہل اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے لاچی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ مگر اسٹیشن ماسٹر کے سامنے آتے ہی لاچی نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھ کے بڑی بے غیرتی سے کھڑی ہو گئی۔ رسک لال اسٹیشن ماسٹر کو کسی طرح کا ہنگامہ قطعی پسند نہ تھا وہ بیوی بچوں والا امن پسند گجراتی تھا۔ ۲۵ سال اسے ریلوے کی سروس کرتے ہو گئے تھے۔ اس کا بڑا لڑکا ریلوے میں ٹکٹ چیکر ہونے والا تھا۔

اس کی چھوٹی لڑکی دملااب کالج میں پڑھتی تھی جس کے لئے بر ڈھونڈنے میں اسے بڑی پریشانی ہو رہی تھی پھر دن بھر اسٹیشن چلانے اور خوش اسلوبی سے چلانے کی ذمہ داری تھی۔ اور ابھی وہ گنگادین بھیا گھاس والے سے اسٹیشن ویگنوں کا معاملہ طے کر رہا تھا۔ جس سے اسے پانچ سو روپے کے قریب ملنے کی امید تھی کہ بیچ میں یہ ہنگامہ ٹپک پڑا۔ رسک لال نے اپنے پتلے دبلے چہرے کی تھوڑی ٹھنٹھ کو کھجاتے ہوئے بھرے بھرے بدن والی لاچی کو دیکھا پھر بارڈ سنتری کو دیکھا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ تلخ لہجے میں بولا۔

کیا ہے۔

یارڈ سنتری نے لاچی کو ہاتھ لگا کر کہا۔

اس نے یارڈ سے کوئلہ چرایا ہے۔

لاچی نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹک کر کہا۔

مجھے ہاتھ مت لگا۔ دور سے بات کر

مجمع میں ہنسی اور مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مادھو پھل والا خوشی سے چیخ کے بولا۔

ابے کاٹ کھائے گی سنتری! بھیڑوں کی رانی ہے یہ۔

تو چپ رہ پکے پپیتے۔

لاچی مادھو کی طرف دیکھ کر بولی۔

مادھو پھل والا میانے قد کا گدرائے بدن کا تھا۔ وہ اپنی کمر پر صرف ایک میلی کچیلی جھول سی دھوتی باندھے رکھتا تھا جو بمشکل اس کے گھٹنوں تک آتی تھی۔ دھڑ کے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے وہ بالکل ننگا رہتا تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا، اس کے جسم پر کہیں ایک بال نظر نہ آتا۔ اور اس کے سانولے رنگ میں ایک ایسی سبزی مائل چمک تھی کہ جب لاچی نے اسے کچا پپیتا کہا تو یہ پھبتی اس پر بالکل چپک کر رہ گئی۔

اور مجمع پھر بے اختیار ہنسنے لگا۔ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لئے اسٹیشن ماسٹر نے جلدی جلدی لاچی سے پوچھا۔

تو نے پپیتا چرایا ہے۔

پپیتا نہیں کوئلہ چرایا ہے۔

لاچی بے اختیار ہنس کر بولی۔ اور اسٹیشن ماسٹر کی طرف انگلی اٹھا کر مجمع کی طرف داد طلب نگاہوں سے جیسے کہنے لگی۔ دیکھ لو، ایک احمق یہ بھی ہے۔

رسک لال نے گھبرا کر کوئلے کی جگہ پپیتا کہہ تو دیا۔ مگر اب مجمع کو ہنستا دیکھ کر خود اس کی ہنسی بھی رک نہ سکی۔ غصّے میں بھرا ہوا یارڈ سنتری بھی ہنس پڑا۔ رسک لال نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر نظریں جھکاتے ہوئے بناوٹی سنجیدگی سے کہا۔ جانے دو یارڈ سنتری! اس وقت ٹن ڈاؤن کے آنے کا وقت ہو رہا ہے اور تم یہ جھگڑا لے آئے۔ پھر رسک لال نے گھبرا کر لاچی کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ جاؤ۔ لیکن پھر کبھی اسٹیشن یارڈ سے کوئلہ نہ چرانا ورنہ جیل میں بھیج دوں گا۔

"اچھا"

لاچی نے اسٹیشن ماسٹر کی میز سے مڑتے ہوئے اس طرح کہا جیسے وہ اسٹیشن ماسٹر پر نہیں، سارے مجمع پر احسان کر رہی ہو۔ اور نیلی چھینٹ والے پھولدار گھاگرے کو جھلاتی ہوئی ننگے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی۔

اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے نکل کر وہ نمبر ایک پلیٹ فارم پہ آ گئی۔ اور تیز تیز قدموں سے باہر کے گیٹ کی طرف جانے لگی۔ لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کیوں کہ لوگ اکثر اسی طرح دیکھتے تھے۔ مرد حسرت سے دیکھتے تھے عورتیں رشک سے۔ لاچی خانہ بدوشوں کی لڑکی تھی۔ جانے کتنی نسلوں، قوموں، رنگوں کے باہم امتزاج کے بعد حسن کا یہ نادر نمونہ تیار ہوا تھا۔ اونچا پورا قد، سنہر اگندمی رنگ۔ گہری سبز آنکھیں، سینے میں کمان کا سا خم۔ اور تناؤ۔ اور کمر میں تیر کی سی سبک اندازی لئے جب لاچی چلتی تھی۔ تو اس کامل اعتماد سے جیسے ساری دنیا اسے جھک کر سلام کر رہی ہو۔

ایسی عورتوں کو واقعی جیل بھیج دینا چاہیئے حمیدے ٹیکسی ڈرائیور نے لاچی کو گیٹ کے باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

حمیدا ٹیکسی ڈرائیوروں کا سرغنہ تھا۔ اور اسٹیشن کے آس پاس کے علاقے کا دادا سمجھا جاتا تھا۔ اس علاقہ میں شراب۔ چرس۔ افیون اور لڑکیوں کا دھندا اسی کی معرفت ہوا کرتا تھا۔ وہ کالا ناٹا۔ گٹھے ہوئے بدن کا انتہائی پھرتیلا نوجوان تھا۔ اور اپنے زعم میں بہت کچھ تھا۔ اور جو اسے بہت کچھ نہیں سمجھتا تھا وہ اسے ٹھیک کر دیتا تھا۔ خود رسک لال اسٹیشن ماسٹر اس سے ڈرتا تھا۔ اور ہمیشہ طرح دیتا تھا۔

مگر لاچی حمیدے سے بالکل نہیں ڈرتی تھی۔ اس نے جب حمیدے کا یہ فقرہ سنا تو اس نے جواب میں زور سے حمیدے کی طرف تھوک دیا اور کمر کو جھلاتی ہوئی اور پیٹھ کھجاتی ہوئی اپنی کالی چولی کی باہیں ٹھیک کرتی ہوئی آگے کے بس اسٹینڈ کی طرف بھیک مانگنے کے لئے بڑھ گئی کیوں کہ اس وقت پوری دلی لوکل پلیٹ فارم نمبر دو پر آ چکی تھی۔ اور لوگ گیٹ سے بھاگتے ہوئے بس اسٹینڈ پر کیو لگانے کے لئے کھڑے ہو رہے تھے۔

حمیدے کو لاچی کے تھوکنے پر ذرا غصہ نہ آیا۔ دو تین بار اس نے ڈرا دھمکا کے لاچی کو اپنے رعب میں لانا چاہا تھا۔ مگر ہر بار منہ کی کھانی پڑی تھی۔ اسے جلدی معلوم ہو گیا کہ لاچی کا بدن بے حد مضبوط ہے اسے خانہ بدوشوں اور نٹنیوں کے کئی گر ایسے یاد ہیں۔ جن کی مدد سے کسی مرد کو پٹخنی دے سکتی ہے۔

لاچی عام شہری یا دیہاتی عورتوں کی طرح نہیں تھی۔ جو مرد کا ایک گھونسہ کھاتے ہی چٹائی کی طرح بچھ جاتی ہیں۔ حمیدا لاچی کو چھیڑنے کا عملی تجربہ کر چکا تھا۔ اس لئے اب تھوکنے پر بھی کھسیا کے ہنس دیا تھا۔ اور منہ پھیر کر اپنی ٹیکسی کی طرف چلا گیا۔

لاچی نے چلتے چلتے مادھو کی دکان سے ایک امرود اٹھا لیا اور اپنے بے حد سفید اور متناسب دانت اس میں گاڑھ دیئے۔ اور اسے ایک گلہری کی طرح کھانے لگی۔ وہ امرود کھاتی

جاتی تھی اور شریر نگاہوں سے مادھو کی طرف دیکھتی جاتی تھی۔ جو بالکل مبہوت ہوکر لاچی کے چہرے کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے لوہا مقناطیس کو دیکھتا، اگر وہ دیکھ سکتا یہ کہنا مشکل ہے کہ مادھو اس وقت کیا دیکھ رہا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں کیسی گرسنا بےبسی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے گیلے ہونٹوں سے یہ الفاظ ادا کئے۔

امرودوں کا پورا ٹوکرا لے جاؤ۔

لاچی نے آدھا کھایا ہوا امرود اس کے منہ پر دے مارا۔ اور آگے بڑھ گئی جب وہ مادھو کی دُکان کے پیچھے باہر گئی اس وقت ڈوبتے سورج نے اس کے بکھرے بکھرے گھنیرے سُرخ بالوں کو چھولیا۔ اور لاچی کے سر کے گرد شعلوں کا ایک لپکتا ہوا تڑپتا ہوا ہالہ سا بن گیا۔ اور غریب مادھو نے اسے دیکھ کر بے اختیار کہا۔

معلوم ہوتا ہے بیری کے جھاڑ کو آگ لگی ہے۔

پھر وہ چپکے سے لاچی کا جھوٹا امرود کھانے لگا۔ اور لاچی کو دکھا دکھا کے کھانے لگا۔

تیرا جھوٹا کھا رہا ہوں لاچی۔

لاچی نے چلتے چلتے مڑ کر وار کیا۔

میرا ٹھوکا ہوا۔

اب لاچی بس اسٹینڈ کے کیو تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھیک مانگنا شروع کر دیا۔

عینک والے بابو ایک آنہ

چھاتے والی بی بی ایک آنہ

ہنڈل والے سردار جی ایک آنہ

جیسے وہ بھیک نہ مانگ رہی ہو۔ کیو میں کھڑے ہوئے لوگوں کو نیلام کر رہی ہو۔ سارا مال لٹا دیا ایک آنے میں۔

ایک بابو نے اس کی جانب آنکھ مار کے کہا ۔
بارہ آنے دوں گا ۔
اپنی ماں کو دے ۔
تڑاخ سے لاچی نے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی ۔

اس دُنیا میں بڑی مشکل ہے ۔لیکن خانہ بدوشوں کے لئے تو یہاں اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ کھیتوں میں اُگے ہوئے پودوں کی طرح جو لوگ ایک ہی شہر یا گاؤں میں رہتے ہیں وہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں ۔

خوشی کی ہوا میں ایک ساتھ لہلہا کر سرسرانے میں گیت گاتے ہیں اور اُونچے ہو جاتے ہیں ۔ بھوک کے پالے میں ایک ساتھ ٹھٹھرتے ہیں ۔ اور بیماری کی وبا میں ایک ساتھ گر کر کٹ جاتے ہیں ۔لیکن خانہ بدوشوں کے لئے ہر جگہ مشکل ہے ۔ وہ ہر کھیت کے کنارے اجنبی ہیں ۔ اور ہر گاؤں کی مد میں انجانے ۔ شہر کی گلی کا ہر موڑان کے لئے ایک نیا خطرہ ہے اور ہر چوراہے کا سنتری ہر وقت بے دخل کرسکتا ہے وہ ہر جگہ اکیلے ہیں ۔ یہ لوگ جو کسی قوم، کی مذہبیت' کسی رنگ اور کسی ملک کے نہیں ہیں ۔ یا شاید یہ سب کے ہیں اس لئے یہ کسی کے نہیں ہیں ۔ ان کے رنگ میں سب کا رنگ ہے ان کے خون میں سب کا خون ہے ۔ اور ان کی زبان میں سب سب کی زبانیں ہیں ۔ یہ لوگ جو اپنا خیمہ، اپنی چٹائی، گھاس کے چند تنکے لئے گھومتے ہیں، کس آشیانے کی تلاش میں ہیں ۔ اپنی کاوش کا انجام انھیں خود معلوم نہیں ۔

لاچی اپنے قبیلے میں اپنے چاچا مامن کے پاس رہتی تھیں ۔کیوں کہ چاچا مامن کے پاس اس کی ماں رہتی تھی ۔ اور اس کی ماں چاچا مامن کے پاس اس لئے رہتی تھی کیوں کہ اس کا شوہر رگی ایک بار شراب پی کر اسے جوئے میں ہار گیا تھا ۔ ان دنوں لاچی صرف چار سال کی تھی ۔ اس لئے جب ماں کے ساتھ بیٹی بھی آگئی تو مامن بہت خوش ہوا ۔کیوں کہ خانہ بدوشوں کے قبیلے میں عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ کماتی ہیں ۔ مرد دن میں چار آنے کی ٹوکری تیار کرتے ہیں یا

تین دن میں تو آنے کی چٹائی بُن لیتے ہیں۔ لیکن عورتیں آرٹ سلک کے گھیر ے دار گھاگرے پہنے، ریشم کی چولی چمکائے آنکھوں میں سُرمہ ہونٹوں پر مُسکراہٹ لگا ہوں میں دعوتِ نظارہ لئے گلی کوچوں کے موڑ پر بیٹھتی ہیں اور عینکیں بیچتی ہیں جڑی بوٹیاں بیچتی ہیں۔ گلٹ کی انگوٹھیاں جھمکے آویزے نگینے، کانچ کے ہار بیچتی ہیں اور خوب کماتی ہیں۔ ورنہ یہ خوب صُورت کپڑے یہ اُونچی ایڑی کے جوتے یہ کھائے پیئے شاداب جسم کہاں سے آتے ہیں۔ کسی فیکٹری سے ڈھل کر تو آتے نہیں۔ اس کے علاوہ خانہ بدوشوں کی بہت جوان عورتیں پُرانا دھندہ بھی کرتی تھیں۔ لاچی اپنے قبیلے میں روشنی باماں بستی۔ منیاں یہی کرتی تھیں۔ شام ہوتے اسٹیشن یارڈ کے مغربی کنارے پر جہاں خانہ بدوشوں کے خیمے تھے۔ وہاں پر کئی موٹریں آکر کھڑی ہو جاتی تھیں کیونکہ شہر میں ایسی اچھی اور مقابلتاً سستی چیزیں کہاں سے مل سکیں گی۔ اور ہر بیوپاری وہی مال خریدنا چاہتا ہے جو اچھا ہو اور نسبتاً سستا ہو۔ تم لوگ امیر آدمی کی رات کو کیا سمجھتے ہو۔ دن بھر کے کتنے دھوکوں جھوٹے وعدوں چھینا جھپٹیوں اور اہلِ فریبیوں کے بعد۔ صبح سے شام تک ضمیر کا خون کرنے کے بعد تو رات آتی ہے۔ اس رات میں وسکی کی نئی بوتل نہ ملے تو لعنت ہے اس کار کرنے پر۔ پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لئے ہر احمق کام کرتا ہے۔

اس لئے جب رات آتی ہے تو ہر خانہ بدوش قبیلے کے ڈیرے پر نہنا یت چمکتی ہوئی کاریں لے کر آتی ہے۔ اور کھُلی ہوا میں پلے ہوئے شاداب جنگلی پھولوں کو چُن کرلے جاتی ہے۔ بیسویں صدی پہلی صدی سے ملتی ہے اور اس تہذیب کے ارتقار میں اس نے جو کھویا ہے اسے پانے کی سعی کرتی ہے۔ اور جو پایا ہے اسے کھونے سرشاری میں رات گزار دیتی ہے۔

اور جب رات گزر جاتی ہے تو کاریں اپنے آفس چلی جاتی ہیں اور غریب خانہ بدوش لڑکیاں فٹ پاتھ پر مجمع لگا کر عینکیں بیچتی ہیں۔ ہے کوئی جو عینک لگا کر دیکھے!

دوسرا باب

شام ڈھل کر رات میں گم ہو رہی تھی۔ جب لاچی اپنے خیمے میں واپس آئی۔ خانہ بدوشوں کے خیمے اسٹیشن یارڈ کے مغربی جانب تھے۔ یہاں گھاس کا ٹیڑھا میڑھا بیچ بیچ پتھروں سے اٹا ہوا ایک کشادہ قطعہ تھا۔ جس کے شمال میں گل مُہر کے پیڑوں کی ایک قطار چلی گئی تھی۔ مغربی کنارے پر میں پتھر کے کوئلے کا ایک شیڈ تھا۔ اور بہت سا کوئلہ ترپال سے ڈھکا ہوا شیڈ سے باہر پڑا تھا۔ جنوب میں گنگا دین بھیا گھاس والے کی گھاس کے سینکڑوں گٹھے ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے۔ مشرقی جانب ایک پُرانا تالاب تھا۔ جس کے پرے وکٹر کانٹے والے کا کواٹر تھا۔

گل مُہر کے پیڑوں کی قطاروں سے پرے موٹر روڈ تھی۔ جو ہوائی اڈے کو جاتی تھی۔ ہوائی اڈے سے پرے شمالی پہاڑیوں کا ایک لمبا سلسلہ تھا۔ جن کی چوٹیوں پہ ہوائی جہاز کو خبردار کرنے کے لئے رات میں لال لال روشنیاں جگمگاتی تھیں۔

لاچی جب ریلوے کے یارڈ کا جنگلا لانگھ کر جوہر کے کنارے چلتی ہوئی ایک ٹیلے کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا، اس کا باپ رگی ٹیلے پہ بیٹھا پتھروں سے کھیل رہا ہے۔ رگی کی پیٹھ لاچی کی طرف تھی لیکن لاچی کو معلوم تھا کہ اس کے باپ نے اسے دیکھ لیا ہے وہ اس کے قریب سے ہو کر جانے لگی تو رگی نے خاموشی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ایک عرصہ سے رگی

کا یہ دستور تھا کہ وہ شام ڈھلے ٹیلے پر پہنچ جاتا ۔ اور اپنی بیٹی کا انتظار کرتا ۔ اور جب لاچی اس کے سامنے سے ہو کر جانے لگتی تو دست سوال آگے بڑھا دیتا ۔

لاچی نے جیب ٹٹولی اور اس میں سے چار آنے نکال کے رگی کے ہتھیلی پہ رکھ دیئے ۔ اور پھر خاموشی سے آگے بڑھ گئی ۔ باپ بیٹی میں کوئی بات نہیں ہوئی ۔ جس دن سے رگی اپنی بیوی اور بیٹی کو جوئے میں ہار گیا تھا ۔ اس دن سے بیٹی کو بھی اس سے نفرت ہو گئی تھی ۔ رگی بے حد نکما اور کاہل تھا ۔ یوں وہ دف بجانے ۔ ناچنے ۔ گانے اور شراب پینے میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہے ۔ اس کی آواز بڑی پاٹ دار اور سُریلی تھی ۔ اور وہ ٹوکریاں بھی بہت اچھی بناتا تھا ۔ لیکن کام کرنے سے جیسے اُسے نفرت تھی ۔ خانہ بدوشوں میں اس کے کپڑے سب سے زیادہ میلے کچیلے اور پھٹے پُرانے ہوتے تھے ۔ ان میلے چیکٹ کپڑوں میں اس کی بڑھی ہوئی داڑھی کے اُوپر تانبا رنگ رخسار ہر وقت ایک عجیب شرارت سے چمکتے تھے ۔ چوئی نے کر اس نے اپنی پُرانی واسکٹ میں ڈال لی ۔ اور پھر پتھروں سے کھیلنے لگا ۔ کئی بار لاچی کا جی چاہا کہ اپنے باپ کو ریزگاری دینے کی بجائے اس کے شرارت بھرے چہرے پر ایک تھپڑ رسید کر دے لیکن ہر بار جانے کون سا جذبہ تھا جو اس کے ہاتھ روک لیتا تھا اور وہ مجبور ہو جاتی تھی کہ اپنے باپ کے کالے گھنے بالوں والے ہاتھ کی ہتھیلی پہ چار آنے رکھ دے ہاں آگے بڑھ کر اپنے خیمے کی طرف جاتے ہوئے وہ ہمیشہ یہی سوچتی تھی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے وہ اس کو تھپڑ کیوں نہیں مار سکتی ۔

اس دنیا میں ہر جذبہ اپنا تاوان کیوں وصول کر لیتا ہے ۔ اس نے ایک چھوٹے سے پتھر کو اپنے ننگے پاؤں سے ایک ٹھوکر ماری ۔ اور لڑھکتے ہوئے پتھر کے بیچ بھاگتے بھاگتے وہ اپنے خیمے تک پہنچ گئی ۔ خیمے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک سی گئی ۔ خیمے کے باہر ایک چٹائی بچھا کر اس کا چچا مامن اور قبیلے کا سردار دیارد مٹی کے پیالے میں ٹھرا پی رہے تھے اور تاش کھیل رہے تھے ۔ لاچی کی ماں مامن کے کندھے سے لگی تاش

کے پتّوں کو دیکھتی ہوئی اپنے خاوند کو مشورہ دیتی جاتی تھی۔ اور کبھی کبھی مامن کا پیالہ اٹھا کر اس میں سے ایک گھونٹ پی لیتی تھی۔ لیکن خاوند بیوی دونوں کی کوشش کے باوجود مامن ہار رہا تھا اور سیاہ رنگ اور طوطے کی ناک والے دمارو سردار کے چہرے پر فتحمندی کی ابلیسانہ چمک تھی!

لاچی کے پاؤں کی آہٹ سُن کر تینوں نے مُڑ کر لاچی کی طرف دیکھا۔ دمارو کے چہرے پر ایک عجیب حریصانہ چمک نمودار ہوئی۔ مامن کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور مامن کی بیوی نے ایک کھوکھلی ہنسی ہنس کر اپنی جھولی لاچی کی طرف پھیلا دی۔ لاچی نے اپنی جیب سے ساری ریزہ گاری نکال کے اپنی ماں کی جھولی میں ڈال دی اور لچکتی ہوئی خیمے کے اندر چلی گئی۔

"مجھے دیدے کوئی!"

مامن نے ہاتھ آگے بڑھا کے اپنی بیوی سے کہا۔

"ٹھہر تو کمبخت گن لینے دے۔" وہ گنتے گنتے بولی۔

"گن کے کیا کرے گی۔" مامن نفرت سے بولا۔ "ہوں گے پندرہ بیس آنے۔ جن میں سے چار چھ آنے وہ تجھ سے پہلے خصم کو دے آئی ہوگی۔"

"اور تم جو یہ جُوا کھیل رہے ہو۔ یہ شراب پی رہے ہو۔ یہ کچھیل کھا رہے ہو۔ یہ کس کی محنت کی کمائی ہے۔" یکایک کوئی غصّے سے اپنے خاوند کی طرف دیکھ کر بولی۔

مامن کی بیوی نے بالکل ٹھیک طعنہ دیا تھا۔ وہ ادھیڑ ہوگئی تھی پھر بھی اتنی خوبصورت تھی کہ اگر دل لگا کر شکار کرتی تو آٹھ دس روپے اینٹھنا اس کے لئے مشکل نہ تھا لیکن اب اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ جب گھر میں جوان بیٹی موجود ہو تو کس ماں کا جی خود دھندہ کرنے کو چاہے گا۔ سوچنے کی بات ہے کس انسان کا دل آرام کرنے کو نہیں چاہتا۔

لیکن آج مامن کا جی پینے اور جُوا کھیلنے کو چاہ رہا تھا۔ اور اس نے لاچی کی ماں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ آج اس کے لئے کہیں نہ کہیں سے بندوبست کر دے۔ اور یہ تو دونوں کو معلوم تھا کہ لاچی مرتے مرتے مر جائے گی لیکن یہ بندوبست نہ کرے گی۔ اس لئے بیچاری

غریب ماں ہی کو کچھ کرنا پڑا ۔ اس لئے ٹھرّا پیتے پیتے لاچی کی ماں کو بھی ایسا محسوس ہوا تھا جیسے زہر کا گھونٹ پی رہی ہو ۔ اسے لاچی پر بے حد غصہ آتا تھا ۔ لیکن مامن کی بات بھی برداشت نہ کر سکی تھی ۔

مامن یہ سُن کر چپ تو ہوگیا ۔ لیکن اس کے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی ۔ اس آگ پر تیل جھڑکتے ہوئے دمارد نے کہا ۔

جوان عورت سونے کی کان ہوتی ہے ۔ اور پھر لاچی ایسی خوب صُورت لڑکی !

لاچی نے فوراً کہا ۔

تم مجھے کوئلوں کی کان سمجھ لو یا پتھر کی کان ۔ لیکن میں دھندہ نہیں کروں گی ۔

تم بیچ میں مت بولو ۔ مامن کی بیوی نے لاچی سے سختی سے کہا ۔ جاؤ مچھلیاں تل کے لاؤ ۔

لاچی خیمے کے ایک طرف مچھلیاں تلنے لگی ۔ آگ کے شعلوں کی روشنی میں وہ اور بھی خوب صُورت دکھائی دے رہی تھی ۔ دمارد سردار نظر بچاکر بار بار اس کی طرف دیکھ لیتا تھا ۔

آج دمارد سردار بہت خوش تھا ۔ وہ برابر جیت رہا تھا ۔

بہت رات گئے جب ٹھرّا ختم ہوگیا ۔ اور لاچی کی آنکھوں میں نیند آنے لگی اور دیئے کی لو بجھنے لگی تو اُن لوگوں نے بازی اُٹھا دی ۔ مامن کی بیوی نے جب حساب کیا تو مامن پچاس رُپے ہار چکا تھا ۔ مامن نے اپنی جیب ٹٹولی ۔ اس میں صرف دس آنے کے پیسے نکلے ۔

دس آنے کم پچاس ۔ دمارد نے سختی سے کہا اور ہاتھ پھیلا دیئے لاؤ ۔

مامن کی بیوی اُٹھ کے خیمے کے اندر چلی گئی ۔ اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں تین روپے تھے ۔ تین روپے دس آنے کم پچاس ۔

دمارد پھر چلّایا ۔

میرا دف لے لو ۔ جھانجھ لے لو ۔ مامن کی بیوی بولی ۔ دمارد

دمارد حقارت سے ہنسا ۔

میرا خنجر لے لو۔ جس پر چاندی کی مٹھی ہے
دمارد شرارت سے ہنسا۔ بولا۔
میں تو سونے کے بالوں والی لاچی لوں گا۔
صرف پچاس روپے ہیں۔ ناممکن۔ مامن نے سر ہلا کے کہا۔
دمارد نے جیب سے پچاس روپے اور نکالے اور بولا۔
وہ پچاس روپے تمہیں معاف کئے۔ پچاس اور دیئے۔ اب بولو؟
سو روپے بہت ہوتے ہیں۔ مامن کا جی للچا گیا۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔
بیوی نے انکار میں سر ہلا دیا۔ مامن نے دمارد کو دیکھ کر انکار میں سر ہلا دیا۔
ایک سو پچاس!
دمارد نے پچاس اور بڑھا دیئے۔
دو سو روپے اب مامن کے پاس پڑے تھے۔ اس کے ہاتھ کی انگلیاں بے تاب ہونے لگیں۔ اس نے بہت بے چینی اور مضطرب نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف اس طرح دیکھا۔ لیکن اس کی بیوی نے پھر انکار میں سر ہلا دیا۔
ڈھائی سو۔ دمارد غصے میں چلایا۔
آج تو میں لاچی کو لے کر ہی جاؤں گا۔
ڈھائی سو کی رقم دیکھ کر مامن سے نہ رہا گیا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا ہی دیا۔ لیکن اس کی بیوی نے پھر اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔
دمارد نے جیب ٹٹول کر سو کا آخری نوٹ نکالا۔ سو کا ہرا نوٹ دیکھ کر مامن اور اس کی بیوی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
دمارد اس کے قبیلے کا سردار تھا۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا اتنا امیر ہے وہ تو بظاہر بالکل انھیں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

مامن کی بیوی نے ہتھیار ڈال دیئے۔

مامن نے ساڑھے تین سو کے نوٹ اُٹھا کے اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈال لئے۔
اتنے میں پیچھے سے کسی نے کہا۔
ٹھہرو ـــــ؟
گھوم کے دیکھا تو لاچی کا باپ رگی کھڑا تھا۔ اس کے تانبا رنگ رخساروں پر ایک معنی خیز شرارت جھلک رہی تھی۔
اپنی طرف سب کو متوجہ دیکھ کر بولا۔
سودتو اچھا ہے کولی۔ رگی نے طنز آمیز نگاہوں سے اپنی پہلی بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔
باپ اپنی بیوی کو ستر روپے میں ہار گیا بیوی نے اپنی بیٹی کے ساڑھے تین سو روپے وصول کر لئے۔
پھر ـــــ
مامن کی بیوی زور سے چلائی۔
اس کی آواز میں ایک خطرناک چیلنج تھا۔
رگی نے بڑی نرمی سے کہا۔
میں لاچی کا باپ ہوں۔ ٹھیک ہے میں نے اس کی پرورش نہیں کی۔ مگر اس کی رگوں میں خون تو مرا ہے۔
کون کہہ سکتا ہے۔
مامن کی بیوی زور سے ہنسی۔
رگی نے سُنی اَن سُنی کر کے کہا۔

مجھے میرا حصّہ ملنا چاہیئے۔

بیس روپے تو بھی لے۔

دمارد نے اپنی جیب سے بیس روپے دیتے ہوئے کہا۔ وہ لاچی کے معاملے میں کسی طرح کا جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔ رگی نے بیس روپے اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے دمارو کی طرف شک کی نظروں سے دیکھا۔ بولا۔

اتنے روپے تو خانہ بدوشوں کی ملکہ کے پاس نہ ہوں گے تمھیں کہاں سے ملے۔ جعلی نہیں ہیں۔ دمارد نے جواب میں بڑی نخوت سے کہا۔ جسے جی چاہے دکھا کے تسلی کرے۔ زیادہ پوچھنے کا تمھیں کوئی حق نہیں ہے۔

نہیں سردار۔

رگی نے یکایک بڑی حلیمی سے کہا۔

تو سودا پکا۔

دمارد نے ایک بار پھر سب سے پُوچھا۔

سب نے اثبات میں سر ہلادیا۔

ایک کے بعد دونوں خانہ بدوش ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔ دمارد نے مامن کی بیوی کا ہاتھ چوم کر کہا۔

یاد ہے میں تجھ پر عاشق تھا لیکن تیرے باپ نے تجھے میرے ہاتھ نہیں دیا۔ رگی کو دے دیا۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد دمارد نے مامن کی بیوی سے آہستہ پُوچھا۔

لاچی کہاں ہے۔

خیمے میں سو رہی ہے۔

دمارو کے لئے اب سب سے مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ رسم و رواج کے مطابق اب

اسے خیمے میں گھس کر لاچی کو اپنی بانہوں میں اُٹھا کر اپنے خیمے تک لے جانا تھا۔ لاچی کوئی نازک دُبلی پتلی راجکماری نہ تھی۔ اچھی خاصی مضبوط ہٹی کٹی بھرے بدن کی لڑکی تھی۔ اور وہ اب بُڈھا ہو چکا تھا۔

اسے آواز دے کر جگا دو۔ یا اسے جگا کر باہر لے آؤ۔ اور اسے سب باتیں بتا دو۔

دمارد کمزور آواز میں بولا۔

رگّی نے شریر لہجے میں کہا۔

یہ غلط بات ہے۔ رسم پوری کرنی ہوگی۔ خیمے کے اندر گھس کر لڑکی کو جگاؤ۔ وہ مزاحمت کرے تو اس کا مقابلہ کرو۔ اسے اپنی بانہوں میں اُٹھا کر اپنے خیمے تک لے جاؤ گے تو لاچی تمھاری ہے ورنہ۔

لیکن مامن نے رگّی کی شرارت تاڑ لی۔ مامن کسی طرح کا جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔ لاچی دھندہ تو کرتی نہیں تھی۔ جتنا کماتی تھی اپنے آپ پر خرچ کرتی تھی۔ ایسی گھوڑی سے کیا فائدہ جو پیٹھ پر ہاتھ نہ رکھنے دے لیکن گھاس کھاتی چلی جائے۔ ایسی خوب صورتی کو لے کر چاٹنا ہے کیا اچھا ہوا اس نے لونڈیا کے ساڑھے تین سو وصول کر لئے۔ ورنہ وہ تو بچا اس میں بھی جاتی تو سودا بُرا نہ ہوتا۔ اس لئے مامن نے دمارد کو تسلی دے کر کہا۔

میں تمھارے ساتھ خیمے کے اندر چلتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کیسے وہ سور کی بچی ــــــ

مامن اور دمارد دونوں ایک ساتھ خیمے کی طرف بڑھے۔ اور دوسرے لمحے میں ایک ساتھ ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔

خیمے کی جھولتی ہوئی سرکو اُوپر اُٹھا کر لاچی باہر آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کی ہتھی والا خنجر تھا۔ اور اس کی گہری سبز آنکھیں سمندر کی طرح غضب آلود تھیں!

تیسرا باب

کس نے بیچا ہے مجھے ؟
لاچی نے ہاتھ میں خنجر اُٹھا کے پُوچھا۔
رگی، مامن دمارد تینوں چپ رہے۔ رگی نے اپنے پاؤں اِدھر اُدھر کئے۔ مامن نے اپنی نگاہیں پھیرلیں۔ دمارد البتہ بالکل مبہوت ہوکر لاچی کی طرف دیکھتا رہا۔
لیکن تینوں میں سے کوئی نہ بولا۔
لاچی کی ماں بولی۔
عورت، گھوڑی اور زمین ہمیشہ بکتی ہے۔ تجھے سردار نے خرید لیا ہے۔
لاچی میں نے تیرے لئے ساڑھے تین سو روپے دیئے ہیں۔ دمارد ایک قدم آگے بڑھا کر لاچی سے بولا۔
خبردار جو میری طرف آگے بڑھا۔
لاچی نے وہیں سے خنجر ہوا میں لہرایا۔
دمارد پیچھے ہٹ گیا۔
لاچی نے ماں سے کہا۔ ماں! سردار کے پیسے لوٹا دے۔
ماں زور سے ہنسی۔ اس کی طنزآمیز ہنسی کا خفتہ انکار تیر کی طرح لاچی کے سینے

میں اُتر گیا۔ لاچی دو قدم آگے بڑھ آئی۔ پھر دو قدم اور بڑھی۔ پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھتے بڑھتے دمارد کے بالکل قریب چلی گئی۔ خنجر اب تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ دمارد کے قریب جاکر خنجر کو بالکل اس کے چہرے کے سامنے کھڑا کر کے بولی۔ اگر ہمت ہے تو مجھے اٹھاکر لے جاؤ۔ کیوں کہ مجھے تیرا یہ لمبی ناک والا شتر مرغ کا چہرہ پسند نہیں ہے۔

دمارد غصّے میں پلٹا اور پلٹ کر بجلی کی طرح اس نے لاچی کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا۔ اور اپنے خیمے کی طرف لے چلا۔ لاچی اس کے بازوؤں میں تڑپی۔ اس کا خنجر ہوا میں لہرایا۔ اور قریب تھا کہ دمارد سردار کے سینے میں پیوست ہو جاتا۔ لیکن دمارد نے اسی وقت اپنے دونوں بازو چھوڑ دیئے اور لاچی دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ اور خنجر مٹھی تک زمین میں گھس گیا۔ مامن نے بھاگ کر خنجر کو زمین سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب لاچی خنجر لینے کے لئے بڑھی تو مامن نے زور کا ایک ہاتھ دیا۔ جو لاچی کی گردن پر لگا اور لاچی دمارد پر جا گری۔ جس نے اسے پھر اپنے بازوؤں میں باندھ لیا۔ لیکن لاچی داؤ لگا کر ایک مچھلی کی طرح اس کے بازوؤں کی گرفت سے نکل گئی۔ دمارد نے پھر اسے پکڑ لیا اور دو گھونسے مار کر زمین پر گرا دیا۔ اور پھر غصّے میں اس کے بال پکڑ کر اسے زمین پر گھسیٹنے لگا۔ لاچی نے اس کی کلائی پکڑ لی اور زور لگا کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ تو دمارد دُہرا ہو کر لاچی پر جا گرا۔ لاچی لچک کر بل کھا الگ ہو گئی اور جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

آؤ میرے سردار مجھے اُٹھا کے لے جاؤ۔

دمارد کی کنپٹی پر ضرب آگئی تھی۔ اور اس کی سانس بھی پھول گئی تھی۔ لیکن وہ غصّے میں بھرا ہوا تھا۔ پھر آگے بڑھا۔ عجیب بات ہوئی کہ اب کے لاچی نے بالکل کوئی مزاحمت نہیں کی۔ دمارد نے اسے پھول کی طرح اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا۔ اور اپنے خیمے کی طرف چلا۔ ابھی دو قدم نہ گیا ہوگا کہ لاچی بغیر کسی مزاحمت کے اس کے بازوؤں میں یوں نکل گئی جیسے پانی چھلنی سے بہہ جائے۔ اب لاچی پھر زمین پر گری اور بالکل بے بس نگاہوں سے دمارد کو دیکھ

رہی تھی۔ دمارد نے پھر ہمت کرکے اسے اپنی بانہوں میں اُٹھالیا۔ اور اپنے خیمے کی طرف جانے لگا۔ اب کے وہ آدھا راستہ طے کر گیا۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد لاچی پھر لپک کر اس کے بازوؤں میں سے پھسل گئی۔ اور اپنے خیمے کو بھاگ گئی۔ دمارد اس کے پیچھے دوڑا خیمے کے قریب اس نے لاچی کو پھر جا پکڑا۔ لیکن لاچی نے جھک کر اس کی ٹانگوں میں گھس کر اسے جو پٹخنی دی تو دوسرے لمحے میں دمارد کا سر زمین پر تھا۔ اور ٹانگیں ہوا میں معلق! دمارد کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھا اور ایک پاگل ہانپتے ہوئے بونے کی طرح چیختا چلاتا ہوا لاچی پر حملہ آور ہوا۔ اور لاچی اسے پھر پٹخنی۔ پھر پٹخنی دی۔ اب دمارد کا دم اکھڑ چکا تھا۔ آخری پٹخنی کھا کر اس سے زمین سے اُٹھا بھی نہ گیا۔ وہ وہیں زمین پر لیٹا لیٹا ہانپتا رہا۔ لاچی نے آگے بڑھ کے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اور بڑے ڈرامائی انداز میں۔ اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف اٹھا کر بولی۔ میرے سردار! مجھے اپنے خیمے میں لے چلو۔

دمارد نے اسے زور سے لات مارنے کی کوشش کی۔ لیکن لات کھانے سے پہلے ہی لاچی وہیں زمین پر دوہری ہوگئی اور وہیں خاک پر لوٹتی، چکریاں لیتی دمارد سے اور دور چلی گئی۔ اور دمارد اپنی لات کے جھٹکے سے پھر زمین پر گرا۔ لاچی زور زور سے ہنستی ہوئی کھڑی ہوگئی اور اب تو سردار کی حالت دیکھ کر مامن اور اس کی بیوی سے بھی نہ رہا گیا۔ وہ بھی زور زور سے ہنسنے لگے۔ دمارد کو بہت غصہ آیا۔ بولا۔

مامن تم لوگوں نے اسے ساڑھے تین سو کے عوض میرے ہاتھ بیچا ہے یا لڑکی میرے حوالے کرو۔ یا میرا روپیہ مجھے واپس کردو۔

مامن بولا۔ روپیہ نہیں مل سکتا۔

مامن کی بیوی بولی۔ لڑکی مل جائے گی۔ ذرا صبر کرو۔ لاچی بولی۔ روپیہ مل جائے گا میرا خیال چھوڑ دو۔ دمارد کا بند بند دکھ رہا تھا۔ اس نے درد سے کراہتے ہوئے کہا تمہارے خیال کی ایسی تیسی۔ میرا روپیہ واپس کرو۔

مامن کی بیوی بولی ۔ روپیہ نہیں ملے گا ۔

تو لڑکی دو ۔

لڑکی بھی نہیں ملے گی ۔ لاچی بولی ۔

تو روپیہ دو ۔ دمارد بولا ۔ نہیں تو میں معاملہ پنچایت میں رکھوں گا تمہیں برادری سے خارج کر دوں گا ۔

شہروں میں آج کل کسی کا برادری سے خارج ہونا کوئی ایسے قہر کی بات نہیں ہے ۔ لیکن کسی خانہ بدوش کے لئے اپنے قبیلے سے الگ ہونا قیامت سے کم نہیں ہے ۔

مامن کانپ گیا ۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا ۔ روپیہ واپس کر دینا چاہیے ۔

لاچی کی ماں بولی ۔ ہرگز نہیں ۔ اس گُنیا کے لئے پھر ساڑھے تین سو کہاں سے ملے گا ۔

لاچی نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور بولی ۔ میں تیری بیٹی ہوں ماں ۔

لاچی کی ماں بولی ۔ کچھ بھی ہو جائے ۔ روپیہ دمارد کو واپس نہیں ملے گا ۔ ہم نے لڑکی بیچ دی ۔ شریفوں میں جب ایک بار سودا ہو جاتا ہے تو پھر واپس نہیں ہوتا ۔ سودا ۔ سودا ہوتا ہے ۔

ہاں یہ ٹھیک ہے سودا ۔ سودا ہوتا ہے ۔ مامن بولا ہم نے لڑکی بیچ دی ۔ تم لاچی کو لے جاؤ ۔

مگر میں لاچی کو کیسے لے جاؤں ۔ دمارد ایک عجیب بے بسی کے عالم میں بولا ۔

لاچی چیخ کر ہنس پڑی ۔ ہنستے ہنستے دوہری ہوگئی ۔ دمارد کی نقل کرکے بولی ۔ جیسے بھی ہو مجھے لے جاؤ میرے مالک ۔

سُور کی بچی ۔ دمارد غصے سے بولا ۔

سور کا بچہ ۔ لاچی بہت پیار سے بولی ۔

دمارد کچھ کہتا کہتا رُک گیا۔ آخر وہ اپنے پر جبر کر کے لاچی کے بالکل قریب چلا گیا۔ اور انتہائی سنجیدگی سے اس سے کہنے لگا۔ میں تم پر اس کا فیصلہ چھوڑتا ہوں۔ تم فیصلہ کرو مجھے کیا ملنا چاہیئے۔ لاچی یا ساڑھے تین سو روپے۔ جو تم فیصلہ کرو گی مجھے منظور ہو گا۔

لاچی کی گہری سبز ہنستی آنکھیں ایک دم سنجیدہ سایوں میں کھو گئیں۔ اس نے اپنی ماں اور چچا کے حریص سخت گیر چہروں کی طرف دیکھا۔ پھر دمارد کے لٹکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور اسے دمارد پر رحم آگیا بولی۔ تجھے تیرا روپیہ واپس مل جائے گا۔

کب۔ جب ہمارا قبیلہ بہار کا جشن منائے گا۔

مگر وہ تو تین مہینے کے بعد آئے گا۔ جب تک میں کیا کروں گا۔

میں تین مہینے کے اندر اندر تیرا روپیہ چکا دوں گی۔

اگر نہ چکا یا تو۔

تو تیرے پاس آجاؤں گی۔ تیری لونڈی بن کر رہوں گی۔ جو تو کہے گا وہی کروں گی۔

دمارد نے لاچی کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھا۔ اور اس کا دل خوشی سے لرزنے لگا۔ اور آہستہ سے کہا۔ خدا کرے تو کبھی روپیہ نہ چکا سکے۔ اتنا کہہ کر دمارد تیزی سے پلٹا اور اپنے خیمے کی طرف چلا گیا۔

ماں اور اس کی بیوی خیمے کے باہر سوئے ہوئے تھے لاچی خیمے میں سوئی تھی۔ لیکن آج لاچی کو دیر تک نیند نہ آئی۔ اور وہ دیر تک خیمے کی جالی ہٹا کر آسمان کو دیکھتی رہی۔ اور دیر تک اس کا دل کسی دور افتادہ ستارے کی طرح لرزتا رہا۔ میں کیا چاہتی ہوں۔ اے پُراسرار آسمان کیوں میرا دل دوسری خانہ بدوش لڑکیوں کی طرح نہیں ہے۔ کیوں میں دھندہ نہیں کر سکتی۔ کما نہیں سکتی۔ اپنا جسم نہیں بیچ سکتی۔ میں تو ان سب لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت ہوں۔ پھر یہ کیسا دل ہے میرا؟ جو اپنے قبیلے اس کے رسم ورواج اس کی صدیوں پرانی ریت سے انکار کرتا ہے کیوں میں ایک خیمہ نہیں چاہتی۔ ایک گھر چاہتی ہوں۔ جب بس اڈے پر

اگر رکتی ہے تو اس کے ٹیڑھے میڑھے کیئو میں سینکڑوں ایسے آدمی کھڑے ہوتے ہیں جو ہاتھوں میں ساز و سامان سے بھرے ہوئے تھیلے لئے۔ تھکے ہوئے قدموں سے گھر جانے کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایک ہی بس سے۔ ایک ہی سڑک پر اپنے ایک ہی گھر کو جاتے ہیں اور ہم خانہ بدوش مختلف راستوں پر چل کر مختلف منزلوں سے گھومتے ہوئے کس گھر کو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ اے چپ چاپ ننگے تھکے اونگھتے آسمان کچھ تو بول۔ میرے دل میں ہلچل کیسی ہے کیوں میں چاہتی ہوں کہ بس کے اس لامبے اداس کیئو میں کوئی اداس مرد میرے لئے تھیلا لئے کھڑا ہو اور ہر لحظہ مجھ تک پہنچنے کی تمنا کرتا ہو۔ وہ لوگ دیکھتے ہیں مجھے۔ کبھی کبھی کسی کی نگاہ جم جاتی ہے مجھ پر۔ لیکن وہ نظر۔ وہ اچٹتی پھسلتی ہوئی نظر میری ہوتی ہے۔ وہ میرا مرد نہیں ہوتا میں چاہوں تو اپنے حسن کے زور سے اس کی زندگی کے چند لمحے۔ چند گھنٹے۔ چند دن۔ چند ماہ چھین سکتی ہوں۔ لیکن وہ مرد میرا نہ ہوگا۔ جس طرح وہ کیئو میں کھڑا اور جس طرح وہ بس کا انتظار کر رہا ہے اور جس طرح کی تصویر اس کی آنکھوں میں ہے اور جس کا تصور اس کی آنکھوں میں ہے۔ اور جس میٹھے اور مہربان انداز میں اس نے ڈھاک کے پتوں میں بیوی کے لئے پھپا دینی کو چھپا رکھا ہے وہ انداز میری روح کو کھائے جا رہا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں اس بس کے کیئو میں کھڑے ہر مرد کا منھ نوچ لوں۔ ہلئے اپنے پژمردہ تھکے ہوئے اداس اور جھنجھلائے ہوئے چہروں کے باوجود یہ لوگ اندر سے کیسے خوش نظر آتے ہیں۔ جیسے تاریک بادلوں میں بجلی کوندتی ہے۔ جیسے میلے کچیلے خیمے کے روزن میں سے بہار کی خوشبو آتی ہے۔ اسی طرح ان مردوں کے سانولے، میلے پسینے میں نہائے ہوئے چہروں کے اندر بار بار کیسی کیسی شمع سی روشن ہو جاتی ہے۔ کس کے تصور سے ان کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھتا ہے۔ میں بھیک مانگتی مانگتی شرمندہ سی ہو جاتی ہوں۔ اور میرے سینے میں ہوک اٹھتی ہے کہ کاش میرے لئے کوئی تھک جائے، چور ہو جائے۔ اس قدر مجبور ہو جائے کہ اگر اس کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہ ہو تو چلتے چلتے کسی جھاڑی سے ایک پھول ہی توڑ کر میرے لئے لے آئے۔

ارے یہ کیسا دل ہے میرا۔ دوسری خانہ بدوش لڑکیاں سے کتنا الگ ہے۔ جو اپنے قبیلے میں رہتی ہیں۔ خیمہ در خیمہ، شہر در شہر اور گاؤں در گاؤں گھومتی ہیں۔ جن کا ایک زندگی کا خاوند ہوتا ہے اور ایک رات یا ایک گھڑی کا خاوند بھی ہوتا ہے اور دونوں خاوندوں میں کوئی چپقلش نہیں ہوتی۔ بلکہ خاوند اپنی خوشی سے اپنی بیوی کو سجا کر باہر بھیج دیتا ہے۔ وہ ایک رات یا ایک گھڑی گزار کر آتی ہے اور اس طرح آتی ہے جیسے اپنا جسم نہیں ایک عینک، ایک چھلا بیچ کے آئی ہے۔ اور آتے ہی اپنی ساری کمائی اپنے شوہر کے قدموں میں ڈال دیتی ہے اور اس کے گلے سے لپٹ جاتی ہے۔ میرا جسم، عینک یا چھلا کیوں نہیں۔ کیوں وہ اپنی ہی روح کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے جس کی بے حرمتی میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اے ننگے، بھدے غلیظ سالے آسمان تو نے مجھے کیوں ان خانہ بدوشوں میں پیدا کیا۔ پیدا کیا تھا تو روح بھی ایسی دیتا۔ جو ہر آن اور ہر لحظہ نت نئی جگہوں کا لالچ لے کے آتی۔ میں تو پیڑ کی طرح ایک جگہ گڑ جانا چاہتی ہوں۔ چاہتی ہوں ایک ہی جگہ میرا گھنا سایہ بڑھے۔ ایک ہی جگہ میرے پھولوں کی خوشبو پھیلے اور میرے پھلوں کا رس ٹپکے۔

مجھے بہار بھی وہیں آئے اور خزاں بھی وہیں۔ اور اسی جگہ کی سردی گرمی کھا کر مجھے موت آئے۔ اور میں اسی دھرتی میں سما جاؤں۔ لیکن یہ چلتے ہوئے خیمے۔ یہ بدلتے ہوئے گزرتے ہوئے مناظر جہنم! جہنم۔

اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی لاچی دھیرے دھیرے غم کے بار سے سسکنے لگی۔ لاچی ایسی عجیب لڑکی تھی کہ جس ماحول میں رہتی تھی اس سے الگ سوچتی تھی۔ لاچی ایسی خوب صورت لڑکی تھی اگر وہ لڑکی نہ ہوتی تو سیب کا پیڑ ہوتی۔ ہمالہ کی کنواری برف میں ڈھکی ہوئی چوٹی ہوتی۔ یا زیر آب سمندر کی ریت میں مستور کورل کا گلابی محل ہوتی۔ لیکن قدرت نے اسے عورت بنایا تھا اور ماحول اور اتفاق نے اسے خانہ بدوش بنا دیا تھا۔ اور یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں کہ کبھی انسان سے انصاف نہیں کرتیں۔ قدرت، ماحول۔ اتفاق ان تینوں چیزوں کے زبردست ہاتھوں سے انصاف کو چھیننا پڑتا ہے۔

لاچی کی آنکھوں میں آنسو اُبل آئے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اور

ایک گہرے مصمم ارادے سے اپنے آپ سے کہا۔ میں چھین لوں گی۔ میں حاصل کر کے رہوں گی۔
اس نے اُلٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھے اور زمین پر لیٹ گئی۔
یکایک خیمے کے پیچھے سے آواز آنے لگی جیسے کوئی خیمے کے پردے پر مٹھی بھر بھر کر ریت گرا رہا ہو۔
لاچی اُٹھ بیٹھی۔ دیر تک اس آواز کو سنتی رہی۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے آہستہ سے آہ بھری۔ جیسے کسی نے آہستہ سے کہا۔ لاچی لاچی یکایک خیمے کے باہر سے نکل کر باہر آ گئی۔
باہر گل کھڑا تھا۔

چوتھا باب

گل بلوچی کا لڑکا تھا۔ اور بلوچی کو سب لوگ جانتے تھے۔ کیوں کہ بلوچی ریلوے ملازموں کو اور آس پاس کے رہنے والے سرکاری ملازموں کو روپیہ سود پر دیا کرتا تھا۔ گل بلوچی کا بیٹا تھا۔ مگر باپ اور بیٹے میں بہت فرق تھا۔ لاچی نے گل کو اکثر ریلوے اسٹیشن پر اور ریلوے کے کوارٹروں میں بھی آتے جاتے دیکھا تھا۔ گل کا قد تو اپنے باپ کی طرح پورا چھ فٹ اونچا لانبا تھا۔ چھ فٹ کے قریب لیکن گل کا قد تو اپنے باپ کی طرح چوڑا چکلا اور فربہ اندام نہ تھا۔ دُبلا پتلا اور اکہرے جسم کا تھا۔ بلوچی کی بھنویں گھنی تھیں اور بڑے بڑے گل مچھے تھے لیکن گل کلین شیو تھا بلوچی پُرانے وضعدار لوگوں کی طرح کلاہ لُنگی اور شلوار قمیص پہنتا تھا۔ لیکن گل پینٹ اور بش شرٹ پہنتا تھا۔ بلوچی کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوفناک تھیں۔ اور جب وہ آنکھیں سُرخ کر کے کہتا۔

"تم سود کا روپیہ کیوں نہیں لائے"

تو وہ لوگ ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ گل کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں لیکن ہر وقت جیسے سپنا دیکھتی رہتی تھیں۔ اور بلوچی کہا کرتا تھا کہ یہ سب فرق اس لئے ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کو ولایت اسے تک پڑھا دیا ہے۔ پڑھ لکھ کر بچے کی صحت غارت ہو جاتی ہے وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔

لیکن گل اپنے باپ کا بہت کام کرتا تھا۔ اس کی میٹھی زبان اور حُسن سلوک سے متاثر

ہوا کثر قرضدار باپ کی بجائے بیٹے ہی سے بزنس کرنا پسند کرتے تھے بلوچی کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی لئے وہ روپے کی وصولی کو اکثر اپنے بیٹے کو بھیجا کرتا تھا۔ لیکن وصولی کے سلسلے میں بے حد محتاط تھا۔ ایک ایک پائی کا حساب اپنے بیٹے سے لیا کرتا تھا۔ اگر بیٹا چار چھ روپے سود کے چھوڑ دیتا تو اس سے گھنٹوں جھگڑتا تھا۔ غراتا تھا اور اگر بہت غصے میں ہوتا تھا تو گل کے ایک دو جڑ بھی دیتا تھا۔ اور گل ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح سب سہہ لیتا تھا۔

اس وقت گل کو اپنے سامنے آدمی رات کے وقت دیکھ کر لاچی کو بہت حیرت ہوئی۔ وہ بولی۔

تم بلوچی کے بیٹے ہو۔

ہاں! میں گل ہوں۔

کیا میرے باپ یا ماں نے تمہارا کوئی قرضہ دینا ہے؟

نہیں۔

پھر کیوں آئے ہو

گل چپ رہا۔

بولو۔ لاچی ذرا تیزی سے بولی۔

گل نے کہا۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔

کہو۔

یہاں نہیں۔

تو پھر کہاں؟

گل نے گھوم کر جدھر اشارہ کیا۔ آدھر ریلوے کا پرانا پل تھا۔ اسٹیشن یارڈ کے اوٹر سگنلوں کے قریب ایک زنگ آلود کہنہ پل تھا۔ جو اب استعمال نہ ہوتا تھا۔ کسی زمانے میں یہ پل استعمال ہوتا ہوگا۔ جب یارڈ چھوٹا تھا اور اسٹیشن گمنام سا تھا۔ اس زمانے میں یہ پل استعمال ہوتا ہوگا۔ لیکن اب۔ اب تو یارڈ اس پل کے دونوں طرف پھیل گیا تھا۔ اور یہ پل جس کے

نیچے سے اب یہ صرف دو ریلوے لائنیں گزرتی تھیں ۔ یارڈ کی درجنوں پھیلی ہوئی چمکتی ہوئی فولادی لائنوں کے درمیان ایک بڈھے ناکارہ پنشن خواہ ملازم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا ۔ عرصہ سے ریلوے کے حکام نے اس پل کا جوڑ جوڑ الگ کر کے اسے یہاں سے ہٹا دینے کے احکام جاری کر رکھے تھے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ لوگ اس پل کی ہستی کو بھول گئے ہیں ۔ اس لئے تو یہ پل ابھی وہیں کھڑا تھا ۔ نہ جیتا نہ مرتا تھا ۔ اس زنگ آلود بے چارگی پر کسی کو ترس نہ آتا تھا ۔

گل نے کہا ۔ اس پل پر چلیں گے ۔

اس پل پر کیوں ۔ لاچی نے کہا ۔ یہیں بتا دو ۔

میرے ساتھ جانے سے ڈرتی ہو ۔ گل نے پوچھا ۔

ڈرتی تو میں اپنے باپ سے بھی نہیں ۔ تم سے کیا ڈروں گی ۔

اتنا کہہ کر لاچی گل کے ساتھ ہولی ۔ خیموں کے پیچھے ہوتے ہوئے وہ ریلوے کا فولادی جنگلا کھول کر یارڈ کے اندر چلے گئے ۔ اور تھوڑی دیر کے بعد پرانے پل کی سیڑھیوں پر آپہنچے ۔ ذرا احتیاط سے ۔ گل نے لاچی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا ۔ بیچ بیچ سے سیڑھیاں غائب ہیں ۔

اسی بہانے میرا بازو مت پکڑو ۔ لاچی نے اپنا بازو گل سے چھڑاتے ہوئے کہا ۔ میری بھی آنکھیں ہیں ۔ میں بھی دیکھ سکتی ہوں ۔ تم آگے آگے چلو ۔ میں تمھارے پیچھے آتی ہوں

گل نے فوراً لاچی کا بازو چھوڑ دیا ۔ اور آگے آگے سیڑھیاں چڑھنے لگا ۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں پل کے اوپر پہنچ گئے ۔ یہاں سے اسٹیشن یارڈ اس کی ہری اور لال بتیاں دور تک چمکتی ہوئی فولادی لائنیں ۔ سرمئی دھاریوں کی طرح ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی دور فضا میں گم ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھیں ۔ ادھر ریلوے اسٹیشن پر سناٹا تھا ۔ ادھر خانہ بدوشوں کے خیموں سے پرے گل مُہر کے درختوں کی ننگی سنساتی بانہیں فضا میں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں ۔ گویا مصروف دُعا گویا منتظر فصلِ بہاراں ۔

گل نے کہا ۔ ان ننگی شاخوں پر کب پھول کھلیں گے ۔ اے بلوچی کے بیٹے ۔ لاچی

بڑی نخوت سے بولی۔ تمھیں مجھ سے کیا کام ہے۔صاف صاف بولو۔ پھولوں کا جھانسہ مجھے مت دو۔ میں ہر روز ایسی باتیں سُنتی ہوں تو میرے دل کا پھول ہے۔ تو میرے من کی رانی ہے۔ تو میری دلنواز جان ہے۔ اگر میں یہ باتیں نہیں سنتی ہوں۔ تو میں مادرزاد حرامزادی کُتیا ہوں۔ رنڈی اور گشتی ہوں ایل۔ کیا سمجھے؟ مجھے تیرے باپ کا کوئی قرضہ نہیں دینا ہے۔

گُل پُل کے پرانے آہنی جنگلے پر جُھک گیا۔ آہستہ بولا۔ میں یہاں ہر روز آتا ہوں۔ اسی وقت رات کے دو بجے۔ جب یہاں کوئی نہیں ہوتا اور تیرے جیسے کو تکا کرتا ہوں۔

لاچی مُسکرا کے بولی۔ اب بات سمجھ میں آئی۔

گُل نے کہا۔ مجھے یہ پل بہت پسند ہے۔ کیوں کہ یہ پل کہیں جاتا نہیں۔

لاچی نے پوچھا۔ کہیں جاتا نہیں کا کیا مطلب؟ کیا دوسرے پل کہیں جاتے ہیں۔ سبھی پل اپنی جگہ پر پڑے رہتے ہیں۔

گُل بولا۔ ہاں! لیکن دوسرے پلوں کے مسافر تو کہیں جاتے ہیں نا۔ دوسرے پل کسی کو کسی سے ملاتے ہیں۔ لیکن یہ پل کسی کو کسی سے نہیں ملاتا۔ نہ کسی سڑک کو کسی سڑک سے۔ نہ کسی شہر کو کسی شہر سے نہ گھر کو کسی گھر سے۔ نہ کسی انسان کو کسی انسان سے!

چھک چھک کرتی ہوئی مال گاڑی دیر سے آگے بڑھتی چلی آرہی تھی۔ اب تو وہ اتنے قریب آگئی اس کا سیاہ انجن مہیب اور بھیانک اور دیوزاد معلوم ہونے لگا۔ دوسرے لمحے وہ مال گاڑی شور مچاتے ہوئے پُل کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ اور پُرانا پُل زور زور سے ہلنے لگا۔ اور اس کی ہر چُول کھڑکھڑانے لگی۔ یکایک پُل اتنے زور سے ہلا کر لاچی ایک چیخ مار کر گُل سے لپٹ گئی۔

پُل پھر ساکت ہوگیا۔ لاچی گُل سے الگ ہوگئی۔ لیکن گُل کا ہاتھ بہت دھیرے دھیرے سرک کر لاچی کے ہاتھ سے الگ ہوا۔

گُل نے مُسکرا کے کہا۔ میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ میرا خیال تھا تم عورت ہو۔

لاچی نے بڑی حقارت سے گُل کی طرف دیکھا اور بولی۔ اب اس کے بعد یہ کہہ دو کہ میں خوبصورت

ہوں۔ بہت خوب صورت ہوں۔ تم مجھ پر مرتے ہو اور میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے تمھارے سوا۔ خدا کے لئے وہ سب باتیں فوراً کہہ ڈالو جنھیں سُنانے کے لئے تم مجھے اس پُل پر لائے تھے۔

گل چُپ رہا۔

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ لیکن ہمت کر کے وہ اُنھیں پی گیا اس نے ایک آنسو بھی نیچے نہیں گرنے دیا۔ پھر آہستہ بولا۔

میں تمھیں یہ پُل دکھانے لایا تھا۔ یہ پُل جو کہیں جاتا نہیں۔ میری اُمیدوں کی طرح۔ پڑھے لکھے ہونا! اسی طرح بات گھما پھرا کے کہو گے۔ لیکن مطلب وہی ہے۔ دوسروں کی طرح تم بھی میری عزّت لینا چاہتے ہو۔ آخر کیوں نہ لو۔ میں ایک خانہ بدوش لڑکی ہوں۔

گل نے دانتوں تلے اپنا نچلا ہونٹ رکھ لیا۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔ صرف اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ بولی۔

چلو اب عشق ہو چکا۔ مجھے خیمے تک چھوڑ آؤ۔ ہاں تم نے یہ بتایا ہی نہیں کہ عشق بازی کرنے کے مجھے کتنے پیسے دو گے؟

گل تیزی سے گھوما۔ اس کا ہاتھ لاچی کو مارنے کے لئے اُٹھ گیا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اور لاچی کی طرف پُشت کر کے وہ تیزی سے پُرانے پل کی سیڑھیاں اُتر کے چلا گیا۔ وہ تیزی سے ریل کی پٹریاں پھلانگتا ہوا اپنے گھر جا رہا تھا۔

لاچی وہیں پُل پر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

اور دیر تک ہنستی رہی۔

جب وہ اس کی نظروں سے غائب ہو گیا وہ دھیرے دھیرے اس پُل سے نیچے اُتری اور اپنی کمر کو رقص کے انداز میں جھلاتی ہوئی اپنے خیمے کو چلی گئی۔

دوسرے دن لاچی نے روشی سے مشورہ کیا۔ روشی کی عمر تیس سال سے اُوپر ہو گئی۔

اس کا حُسن بجھتا جا رہا تھا۔ جیسے وہ سُرخی غازے سے ہر روز جلا دیتی تھی۔ روشی خانہ بدوش لڑکیوں میں سے چنٹ اور خرانٹ اور تجربہ کار عورت تھی۔ اس کے گاہک سب سے زیادہ امیر ہوتے ہوتے تھے۔ اور اس کے کپڑے سب سے زیادہ قیمتی ہوتے تھے۔ اور اس کا شوہر جمعدار ن دن رات شراب پیتا تھا۔ اور روشی کی آمدنی کا بیشتر حصّہ شراب اور جوئے میں صرف کرتا تھا۔ اور روشی کو مہینے میں دو چار بار پیٹ دیا کرتا تھا۔ روشی انتہائی سعادت مندی سے مار کھایا کرتی تھی۔ کیوں کہ اس کا اعتقاد تھا کہ اس دُنیا میں ہر شوہر کو اپنی بیوی کو پیٹنے کا حق حاصل ہے۔ مار کھا کر وہ پٹائی کو پسند بھی کرنے لگی تھی۔ بلکہ جب زیادہ دن ہو جاتے تو روشی کی کھال خود اس پٹائی کے لئے تلملانے لگتی تھی۔ اس کے سارے جسم میں خارش سی ہونے لگتی تھی۔ اور وہ کسی نہ کسی بہانے اپنے شوہر سے اُلجھ پڑتی۔ اور پھر پٹ کر اپنے خاوند کے پاؤں دبانے لگتی۔ اسے اپنے خاوند سے بڑی محبت تھی۔ محبت تو اسے اپنے گاہکوں سے بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن وہ تو بس گھڑی دو گھڑی کی محبت ہوتی تھی۔ لیکن خاوند۔ خاوند ہے اور گاہک تو صرف گاہک ہیں۔ دوکان سے سودا تو ہر کوئی خریدتا ہے۔ لیکن دوکان کا مالک صرف ایک ہی ہوتا ہے۔

روشی بہت سمجھدار عورت تھی۔ وہ زندگی سے بڑی خوبصورتی سے مفاہمت کرنا جانتی تھی۔ دراصل یہ دُنیا ایسی ہی سمجھدار عورتوں اور مردوں پہ قائم ہے ورنہ کب کی ختم ہو گئی ہوتی۔ اس لئے روشی سے لاچی سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا۔ روشی نے بات سُن کے کہا۔

ساڑھے تین سو روپے۔ ساڑھے تین سو روپے کیا چیز ہیں تیرے لئے تو ہاں کر میں ابھی ساڑھے تین سو کا گاہک دلائے دیتی ہوں۔

لیکن مجھے گاہک نہیں چاہیئے۔

تو گاہک کے بغیر ساڑھے تین سو کہاں سے ملیں گے۔ روشی حیرت سے بولی۔ تو روپیہ بھی چاہتی ہے۔ اور دھندہ بھی نہیں کرے گی۔ ایسا کیسے چلے گا۔

اگر ایسا نہیں چلے گا تو پھر مجھے بھی کچھ نہیں چاہیے۔

دیر تک لاچی کو جاتے ہوئے دیکھ کر کچھ سوچتی رہی۔ پھر دل ہی دل میں ہنسی۔ کیسی پگلی لڑکی ہے۔ اسے کبھی عقل نہیں آئے گی۔ اس کے بعد وہ اپنی عینکوں کے ڈھیر کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔

ایک بابو اس کے سر پر آکھڑا ہوا۔

روشی نے نگاہ اٹھا کے دیکھا اور مسکرادی بابو عینک چاہیے۔

بابو بولا۔ عینک تو میری آنکھوں پر موجود ہے۔ پھر کیا چاہیے؟ چھلا۔ انگوٹھی۔ جھمکے نگینے جو لینا ہو لے لو۔ روشی ہنس کر بولی۔

مجھے ایک موتی چاہیے! بابو نے آنکھ مار کر اس سے کہا۔

پانچواں باب

روشنی سے ہٹ کر لاچی مادھو کی دکان پر آئی اور سیبوں کی ٹوکری سے ایک سیب اٹھا کر کھانے لگی ۔ مادھو ذرا سا مسکرا دیا ۔ کیوں کہ اس کی دکان پر اس وقت دو تین گاہک کھڑے تھے اور وہ سودا بیچ رہا تھا ۔ جب گاہک چلے گئے تو لاچی نے تین چوتھائی سیب کھا لیا تھا ۔ مادھو نے ٹوکری سے ایک اور سیب اٹھایا اور لاچی کو پیش کیا ۔ لاچی نے پہلا سیب نالی میں پھینک دیا اور مادھو کا پیش کیا ہوا سیب کھانے لگی ۔ سیب کھاتے کھاتے بولی ۔

مادھو تم مجھے بہت چاہتے ہو ؟ ۔

مادھو جواب میں کھکھلا کے ہنس پڑا پھر اس نے شرم سے منہ پھیر لیا ۔

لاچی کو مادھو کی یہ ادا بہت پسند آئی ۔ وہ بولی ۔

بتاؤ نا مادھو ۔ تم مجھے کتنا پسند کرتے ہو ۔

مادھو شرماتے ہوئے بولا ۔ اپنی روجی سے جیادہ ۔ اپنی دکان سے جیادہ ۔ اپنے رزق سے بھی جیادہ ۔

جو میں کہوں گی اسے پورا کرو گے ۔ لاچی بولی ۔

مادھو کے دل میں نہ جانے کہاں سے دیری آگئی ۔ اک دم بول اٹھا ۔

تم چاہو تو دکان چھوڑ دوں ۔ یہ سارے پھل نالی میں پھینک دوں ۔ تم چاہو تو میں گاڑی

کے آگے لیٹ جاؤں۔ تم چاہو تو ....

بس بس۔ لاچی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ تم میرے لئے کہیں سے ساڑھے تین سو روپے کا بند وبست کر دو۔

ساڑھے تین سو۔ مادھو اک دم بجھ سا گیا۔ ساڑھے تین سو کہاں سے لاؤں گا۔ میری تو ساری پونجی پھل ہیں۔ ساٹھ ستر کے یہ پھل ہوں گے۔ پچاس ساٹھ میرے گھر میں ہوں گے۔

میں نہیں جانتی کہ تم کہاں سے لاؤ گے۔ مگر تم میرے لئے لاؤ گے۔ نہیں تو میں زندگی بھر تم سے بات نہیں کروں گی۔ لاچی اک ادا سے خفا ہو کے بولی۔

نہیں نہیں۔ مادھو گھگھیا کے بولا۔ لاچی اتنی خفا نہ ہو۔ دیکھ میری طرف دیکھ لے بس ایک نظر سے دیکھ لے۔

اچھا دیکھتی ہوں۔

لاچی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھکائیں۔ اور مادھو کے دل میں جیسے بجلی کوند گئی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ جیسے سر سے پاؤں تک پگھل گیا۔ آہستہ سے بولا۔ دیکھ آج شام کو آنا میں کہیں سے بند وبست کرتا ہوں۔

اچھا کہہ کر لاچی مادھو کی دکان سے چلی گئی۔ اس کے سر سے بوجھ اُتر گیا تھا۔ اس دن اس نے یارڈ سے سرکاری کوئلہ پھر چُرایا۔ اور حلوائی کے ہاں بیچ کر ڈیڑھ روپیہ وصول کر لیا۔ اس ڈیڑھ روپے کو حاصل کرنے کے لئے اسے یارڈ کے تین چکر لگانے پڑے۔ اس کے بعد اس نے ریلوے کوارٹروں کے کئی چکر لگا ڈالے۔ آخر وہ علی بھائی ٹکٹ چیکر کے پچھواڑے سے ایک پلا ہوا مُرغ چُرانے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس مُرغ کے اسے ساڑھے تین روپے ضرور مل جائیں گے۔ مگر قصائی نہ مانا۔

یہ حرام کا مال ہے۔

مگر پلا ہوا ہے۔ میں اس کے ساڑھے تین لوں گی۔

میں ڈیڑھ سے زیادہ نہ دوں گا۔
ڈیڑھ دے کر تم پانچ میں بیچو گے۔ کچھ تو شرم کرو۔ میں ایک غریب خانہ بدوش لڑکی ہوں۔
میں ایک غریب قصائی ہوں۔
مجھے ساڑھے تین سو کا قرضہ چکانا ہے۔
میرے پانچ بچے ہیں تین بیویاں ہیں۔
چوتھی کی فکر کب کرو گے۔
لاچی نے مذاق کیا۔
جب تم ہاں کر دوگی۔
لاچی ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ بولی۔
اچھا چلو تین روپے دے دو۔
لو نے دو۔
اچھا ڈھائی دے دو۔

دو لینے ہوں تو لے جاؤ۔ ورنہ ان سے بھی جاؤگی۔ اُدھر سامنے سے پولیس کا سنتری چلا آرہا تھا۔ لاچی ڈر گئی۔ اس نے جلدی سے مُرغ قصائی کے حوالے کر دیا۔ اور اس سے دو روپے لے کے چلتی بنی۔ اب تک اس کی جیب میں ساڑھے تین روپے آچکے تھے۔ مگر اس طرح سے کیا ہوگا لاچی چند لمحوں کے لئے فکر میں ڈوب گئی۔ پھر اس کے دل میں وعدے کا خیال اور اس کی بشاشت لوٹ آئی۔ اور وہ قصائی کے ہاں سے لوٹ کر سارا بازار گزر کے واپس بس کے اڈے پر آگئی۔ بھیک مانگنے کے لئے۔ بس کے اڈے پر صرف دو مچھلیاں بیچنے والیاں کھڑی تھیں۔ مارکیٹ میں مچھلیاں بیچ کے آئی تھیں اب خالی ٹوکریاں لئے ہنس ہنس کے ایک دوسرے سے بات کر رہی تھیں۔ جب لاچی نے دستِ سوال آگے بڑھایا تو ان میں سے ایک جھڑک کر بولی۔
شرم نہیں آتی سنڈی! جوان جہاں لوٹھا سی ہو کر بھیک مانگتی ہے۔ جا کوئی کم کرلے۔

تیرے گھر چلی جاؤں ۔ لاچی نے چمک کر جواب دیا ۔

مچھلی والی اسے مارنے کے لئے دوڑی ۔ لاچی ہنستے ہوئے بھاگ گئی ۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں مچھلی والیاں ایک بس میں سوار ہو کر چلی گئیں اور اڈہ پھر خالی ہو گیا ۔

لاچی پھر اڈے پر واپس آ گئی ۔ اب کے دھنیا بھکارن بوڑھی اور اندھی اڈے پر کھڑی خالی اڈے پر بھیک مانگ رہی تھی ۔

لاچی نے اسے سمجھایا ۔ اڈہ خالی ہے ۔ تو کس سے بھیک مانگتی ہے ۔ تم کون ہو ۔ دھنیا بھکارن اپنی کڑوی کراری آواز میں بولی ۔ میں بھی تیری طرح ایک بھیک مانگنے والی ہوں ۔ لاچی یہ کہہ کر زور سے ہنسی ۔

جوان ہنسی ہے تیری ۔ دھنیا غصے سے بولی ۔ لعنت ہو تجھ پر کیوں مجھ غریب بھکارن کی روزی تباہ کر رہی ہے ۔

میں کیا کہہ رہی ہوں تجھے ۔ لاچی حیرت میں بولی ۔

تیرے ہوتے ہوئے مجھے کون بھیک دے گا ۔ دھنیا بہت افسردگی سے بولی ۔ کیسا زمانہ آیا ہے ۔ لوگ بھیک دیتے ہیں تو اچھی صورت دیکھ کر ۔ غریب اندھی بڈھی کو کوئی نہیں پوچھتا ۔

یہ بالکل سچ تھا ۔ اگلے تین چار گھنٹوں میں لاچی نے بھیک مانگ کر ڈھائی روپے کمائے ۔ لیکن اندھی بڈھی دھنیا کے پاس دس پیسے جمع ہوئے ہوں گے ۔ وہ بھی اسے صرف عورتوں نے رحم کھا کے دیئے تھے ۔ لاچی غور سے دیکھتی رہی ۔ کسی جوان مرد نے اسے ایک پیسہ نہیں دیا ۔ سب لاچی کو گھورتے تھے لاچی کے دل میں ایک عجیب سی مسرت کی لہر آئی ۔ وہ پلٹ کے سامنے پان والے کی دکان پر چلی گئی ۔ اور اس سے دو پیسے کا پان کھا کے آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگی ۔ تھوڑی دیر میں پان کی دکان پر بھیڑ لگ گئی تھی ۔

دو پیسے کا گھوڑا مار کہ بیڑی دینا ۔

ایک آنے کی ملطان صاحب بیڑی ۔

کونڈر کا آدھا پیکٹ ۔

وہی سادہ ۔

کالا کانڈی لونگ سپاری ۔

لاچی نے اپنے گھاگرے کے نیفے سے دو پیسے نکال کے پان والے کو دینے چاہے ۔پان والے نے مسکرا کے سر ہلا دیا ۔ بولا ۔

جانی ! بس تو ادھر میری دکان پر آ کے کبھی کبھار دو منٹ کے لئے کھڑی ہو جایا کر ۔ اپنے تو پان کے پیسے یوں ہی وصول ہو جاتے ہیں ۔

ہشت ۔سور کی اولاد ۔

لاچی نے پان والے کو گالی دی ۔ پھر اس نے زور سے پان کی پیک نالی میں گرا دی ۔اور اپنا نیل جھینٹ کا گھیرے دار گھاگرا جھلاتی ہوئی مادھو کی دکان پر چلی گئی ۔کیوں کر اب شام ہو چلی تھی ۔

جب لاچی دکان پر پہنچی تو مادھو اپنی دکان بند کر رہا تھا ۔وہ قریب کھڑی کھڑی اسے دکان بند کرتے دیکھتی رہی ۔ مادھو تو اتنی جلدی کبھی دکان بند نہ کرتا تھا ۔ رات گیارہ بجے پولیس کی روند آنے سے پہلے کہیں دکان بند کرنے پر مجبور ہوتا تھا ۔آج اسے کیا ہو گیا ؟ یکایک لاچی کے دل میں خیال آیا یہ کم بخت میرے آنے سے پہلے ہی دکان بند کر کے بھاگ جانا چاہتا ہے اچھا ہوا میں نے اسے بھاگنے سے پہلے پکڑ لیا ۔

لاچی وہیں مادھو کے پیچھے کھڑی رہی ۔

چپ چاپ ۔

جب مادھو دکان بند کر کے چابیوں کا گچھا جیب میں ڈالتے ہوئے پلٹا اس نے لاچی کو اپنے پیچھے کھڑی پایا ۔ وہ اک دم چونک گیا ۔کچھ جھینپ گیا ۔

لاچی بولی ۔کیوں بھاگ رہے تھے مادھو ۔

نہیں ! مادھو انکار کرتے ہوئے بولا ۔میں تو دکان بند کر رہا تھا اور دکان بند کر کے تیری

راہ دیکھتا ۔

پیسے لائے ۔

ششش! آہستہ بول ۔ مادھو نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ کوئی سُن لے گا۔

سُن لے گا تو کیا کرے گا۔ لاچی بہت بے خوفی سے بولی ۔

تو نہیں سمجھتی۔ ادھر آ۔ ٹیکسی میں بیٹھ ۔ تجھے بتاتا ہوں ۔

لاچی نے مڑ کے دیکھا ۔

چند قدم کے فاصلے پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی ۔ لاچی مادھو کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور ٹیکسی گھما کے اسٹیشن کے اڈے سے باہر لے گیا۔ باہر سڑک پر جاکر ٹیکسی ایک طرف کر کے روک دی گئی۔ یہاں پر درخت کا گھنا سایا تھا۔ اور ایک پبلک ٹیلفون بوتھ تھا ۔ یہاں ٹیکسی رکوا کے مادھو نے اپنی جیب سے نوٹ نکالے اور انھیں لاچی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا ۔

بڑی مشکل سے سو روپیہ ہوا ہے گن لے ۔

دس کے پانچ کے ۔ دو کے ۔ ایک کے نوٹ تھے ۔ میلے اور مُڑے ہوئے پسینے اور بدبو کے مارے ہوئے ۔ کچھ نقدی تھی ۔ اٹھنیاں ۔ چونیاں ۔ دونیاں ۔ اکنیاں ۔ مگر لاچی نے انھیں گن کے کہا ۔ یہ صرف ایک سو ہیں ۔

یہ میری ساری پونجی ہے ۔ اسے رکھ لے ۔ لاچی نے روپے رکھ لئے ۔

مادھو کے سبزی مائل چکنے ہونٹوں پر رال کا لعاب چمکنے لگا ۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے ۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا ۔ اور اس کی کانپتی ہوئی انگلیاں لاچی کے ہاتھ کو چھونے لگیں ۔ اور مادھو آہستہ سے کہنے لگا ۔

اب کہیں چلیں گے ۔

کہاں چلیں گے ۔

لاچی نے پوچھا ۔

کہیں بھی سیر کے لئے چلیں گے۔ مادھو کانپتی آواز میں بولا۔ اور اس کی ترستی ہوئی انگلیاں لاجی کے ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ کہنے لگیں۔

یکایک لاجی کے بدن میں ایک جھرجھری سی آگئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کیچوا یا گندی نالی کا کوئی لجلجا پلپلا سا کیڑا اس کے جسم پر رینگ رہا ہو۔ اس نے سو روپے کے نوٹ زور سے مادھو کے منھ پر مارے۔ اور جلدی سے ٹیکسی کا پٹ کھول کے باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھوں کی گہری سبز جھیلوں میں غصے کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔

کمینے کتے۔

لاجی نے ایک پتھر اُٹھایا۔

ڈرائیور نے جلدی سے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ اور مادھو کو لے کر بھاگ گیا۔ پتھر ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا ٹیکسی کے مڈگارڈ کو چھوتے ہوئے نکل گئے۔ شکر ہے ٹیکسی کا کوئی شیشہ نہیں ٹوٹا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے شکر ادا کیا۔ ورنہ لاجی کے غصے سے خدا بچائے۔ غصے میں یوں بھی نشانہ چوک جاتا ہے۔

لاجی نے چوتھا پتھر اٹھالیا تھا۔ مگر ٹیکسی غائب ہو چکی تھی۔ اور پتھر اس کے ہاتھ میں تھا لاجی نے ایک لمحے کے لئے پتھر کی طرف دیکھا۔ پھر خالی سڑک کو دیکھا۔ پھر اس نے زور سے پتھر سڑک پر پھینک دیا۔ اور بے بس ہو کر رونے لگی۔ اس کو بہت غصہ آرہا تھا۔ وہ کیا کچھ تھی مادھو کو اور مادھو کیا نکلا۔

پبلک ٹیلی فون کے قریب رُک کر اس کے دل میں ایک لمحے کے لئے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ بوتھ کے اندر جا کر خدا کو ٹیلی فون کرے۔ اور اس سے ساڑھے تین سو روپے مانگ لے۔ کیا خدا تک ــــــ یہ ٹیلی فون نہیں پہنچتا۔ کیوں نہیں پہنچتا۔ آخر کیوں خدا اسے کہیں سے ساڑھے تین سو روپے نہیں دیتا کوئی اتنی بڑی رقم تو ہے نہیں آخر کیوں اس دنیا میں کوئی ایک لڑکی کی عزت کے بغیر اسے ساڑھے تین سو روپے دینے کو تیار نہیں ہے۔

ڈارلنگ! یہاں کیسے ٹیلی فون کرنے کے لئے رُکی ہو۔ آؤ میری گاڑی میں

بیٹھ جاؤ۔

لاچی نے پلٹ کے دیکھا۔ خوب صورت آسمان رنگ کی پلالی مُنھ میں ایک نوجوان گاڑی چلاتا اس کی طرف دیکھ کر مُسکراتے ہوئے کہہ رہا ہے۔

لاچی نے ایک پتھر اٹھایا۔

سو رپٹر ول غبار چھوڑتے ہوئے روم سے بھاگ گئی۔

چھٹا باب

شام کو جب لاچی ٹیلے سے گھوم کے اپنے خیمے کو جانے لگی تو اس کے باپ نے روز کی طرح دستِ سوال دراز کیا ۔ لاچی نے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور پلٹ کے چلنے لگی ۔ رنگی نے آگے بڑھ کے اس کا راستہ روک لیا ۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا ۔

کہاں جاتی ہے میرے پیسے دیتی جا ۔

لاچی نے بجلی کی طرح تڑپ کر اپنا ہاتھ رنگی سے چھڑا لیا ۔ اور اُلٹے ہاتھ سے ایسے زور کا تھپڑ اس کے مُنھ پر رسید کیا کہ ہونٹوں سے خون نکل آیا ۔ رنگی حیران و ششدر کھڑا رہ گیا ۔ آہستہ سے اس نے اپنے ہونٹوں سے لہو صاف کیا ۔ اور پھر اپنی ہتھیلی کو غور سے دیکھنے لگا ۔ جہاں تر و تازہ اور سرخ لہو کی ایک چمکتی ہوئی لکیر ہتھیلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھنچی ہوئی تھی ۔

لاچی بولی ۔

اگر تم میرے باپ ہو تو آئندہ جب تک دمار دکا روپیہ نہ چکا دوں کبھی مجھ سے ایک پیسہ بھی نہ ب کرنا ۔

رنگی نے غور سے اپنے خون کو دیکھتے ہوئے کہا ۔

ساڑھے تین سو روپے تم اکیلی کیسے چکاؤ گی ۔

تم دیکھتے جاؤ ۔

لاچی ایک فیصلہ کن انداز میں بولی ۔
رگّی نے بہت افسردگی سے کہا۔
تمھارا جسم عورت کا ہے دل مرد کا ہے ۔ بس یہی سوچ کر افسوس ہوتا ہے ۔
کیوں ۔ لاچی نے رک کے پُوچھا ۔
رگّی بولا ۔

زندگی مختصر ہے ۔ جوانی اس سے بھی مختصر، حسن اس سے بھی مختصر ہے ۔ اس لئے میرا باپ کہتا تھا ۔ گاؤ ۔ بجاؤ ۔ دف بجاؤ ۔ جہاں تک ہو سکے کام نہ کرو اور ہمیشہ چلتے چلو ۔ کسی ایک جگہ بیٹھ جانے سے آدمی شاخ میں لگے پتے کی طرح ایک روز سڑ کر گر جاتا ہے ۔ اس نے لہو کو اپنی میلی آستین سے پونچھ دیا ۔

لاچی نے کہا ۔ مجھے خیمہ نہیں چاہیئے مجھے ایک گھر چاہیئے ۔ ایک آہ کے ساتھ ایک عجیب بے قراری کے ساتھ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ نکلے ۔
وہ اپنے احساس کی شدت سے خود گھبرا گئی ۔ اور جلدی سے وہاں سے چلی گئی ۔
رگّی اسے دیکھتا رہ گیا ۔

دمارد اپنے خیمے کے باہر چٹائی بچھائے پی رہا تھا ۔ روشی اور جاماں اس کی بغل میں تھیں لاچی نے جاتے ہی چھ روپے نکال کے اس کی ہتھیلی پہ رکھے ۔ دمارد روپیں کو لے کر ہنسنے لگا اس طرح کتنی مدت میں قرضہ چکاؤ گی ۔
اسی مدت میں چکاؤں گی جس کا وعدہ کیا ہے ۔ تم فکر کیوں کرتے ہو ؟
تمھارے پھول جیسے جسم کی مجھے فکر نہ ہوگی اور کسے ہوگی ۔
دمارد ہنسا ۔ اس کے ساتھ لڑکیاں بھی ہنسیں ۔ لاچی چُپ رہی ۔
دمارد نے درختوں کی قطار کو غور سے دیکھا ۔ ان کی ننگی شاخوں کو گھورا ۔ پھر نگاہیں ہٹا کر بولا ۔ درخت بھی انتظار کرتے ہیں ۔ وہ بھی میرے دل کی طرح انتظار کرتے ہیں ۔

بہار ابھی بہت دور ہے۔ لاچی اطمینان سے اپنی انگلیاں نچاتی ہوئی اور لپک کر وہاں سے ہولی اور دارد اپنا دل مسوس کے رہ گیا۔

لاچی کی مستانہ خرامی دیکھ کے جاماں اور روشی کے دل میں رشک کا شعلہ سا بھڑک اٹھا۔ جاماں نے دانت پیس کر کہا۔ مالزادی بڑی پارسا بنتی ہے۔

دارد نے دھیرے دھیرے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ اک ذرا ٹھہر جاؤ۔ تم دیکھتی جاؤ کیا ہوتا ہے۔

آج لاچی کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ خیمے کی دیواریں قید خانے کی دیواروں کی طرح چاروں طرف سے اس کے قریب سکتی ہوئی۔ اس کا گلا گھونٹتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دور گھڑیال نے بارہ بجائے۔ ایک بجایا۔ دو بجائے۔ لیکن آنکھوں میں نیند پھر بھی نہ آئی۔ تو لاچی گھبرا کے اٹھی اور خیمے کے پیچھے سے باہر نکل گئی۔ باہر جا کے اس نے اپنی آنکھیں ملیں۔ ایک لمبی سانس لی۔ یکایک اس کی نگاہ دور سامنے کے پرانے پل پر پڑی جس کی پشت پر آؤٹر سگنل کی ہری اور لال بتیاں روشن تھیں پل کے اوپر ایک سایہ کھڑا تھا۔ اور اتنا ساکت و جامد جیسے خود بھی پل پر ایستادہ ایک سگنل ہو۔

گل۔

لاچی کے سارے جسم میں بے اختیار ایک انگڑائی آئی۔ اور سر سے پاؤں تک نشے میں جھوم گئی۔ ایک عجیب فتحمندی اور غرور کے احساس سے اس کا رواں رواں سرشار ہو گیا۔ پہلے اس کے جی میں آیا کہ واپس خیمے میں چلی جائے۔ لیکن اس کے قدم پلٹ نہ سکے۔ اور وہیں کھڑی رہ کر اس سائے کو دیکھنے لگی۔ جو اب تک جامد و ساکت اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ پھر وہ یکایک تیز تیز قدموں سے پھلانگتی ہوئی پرانے پل کی طرف چلی گئی۔

میرا خیال تھا تم ضرور آؤ گی۔

گل نے آہستہ سے اس وقت کہا۔ جب لاچی اس کے قریب آکر پل پر جھک گئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ جھک گیا تھا۔

ہونہہ۔ لاچی نے بڑی نخوت سے کہا۔ میں تو محض اس لیے چلی آئی کہ خیمے میں بڑی

گرمی تھی۔

گُل چُپ ہوگیا۔ دونوں بہت دیر تک چُپ رہے۔

یارڈ بالکل خاموش تھا۔ دور کہیں کسی جانے والی گاڑی کی چُھک چُھک سُنائی دے رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ فضا میں گم ہوتی جارہی تھی۔

سُنا ہے تمہیں ساڑھے تین سو روپے چاہئیں۔

چھ کم ساڑھے تین سو روپے۔

میں تمہیں کل نہیں تو پرسوں کہیں سے لادوں گا۔

کہاں سے لاؤ گے۔

میرا باپ سود پر پیسہ دیتا ہے نا۔ اس سے مانگ لوں گا۔ کیا کہو گے۔

جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سچ سچ کہہ دوں گا۔

سچ لادو گے۔

کل نہیں تو پرسوں۔

پرسوں کہاں پر ملو گے۔

اسی پُل پر۔

کس وقت۔

اسی وقت۔

اور اپنی ٹیکسی کہاں کھڑی کرو گے۔

گُل حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ کون سی ٹیکسی؟ وہی ٹیکسی جس میں تم روپیہ ادا کر کے مجھے کہیں لے جاؤ گے۔ گُل کی سمجھ میں اب بات آئی۔ اس کا سر جُھک گیا۔ اور اس کے مُنھ سے ایک آہ نکلی! لاچی نے بہت تلخی سے کہا۔ میرے سامنے یہ آہ نہ بھرو۔ میں جب سے جوان ہوئی ہوں دن بھر یہی آہیں سُنتی

ہوں ۔ بس کے اڈے میں ۔ اسٹیشن کے یارڈ میں قصائیوں کی دکانوں پر۔ گلی میں ۔ بازار میں ۔ جدھر سے گزرتی ہوں بالکل اسی طرح آہیں سنتی ہوں ۔ کیا تم نے اس کتے کو دیکھا ہے جو ہڈی دیکھتے ہی زبان باہر نکالنے لگتا ہے ۔

سبھی مرد ایک سے نہیں ہوتے ۔

سبھی کتے ایک سے ہوتے ہیں ۔

گل نے لاچی کا بازو زور سے پکڑ لیا ۔ اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا ۔ وہ لاچی کے بازو کو اپنی انگلیوں کے زور سے مسلتے ہوئے بولا ۔

خدا کی قسم بہت خبیث عورت ہو ۔ خبیث اور جاہل ۔ مجھے تم سے نفرت ہے ۔ نفرت ہے ۔ نفرت ہے ۔

پھر اس پل پر کیوں ہو ۔ لاچی نے یکایک بہت نرم اور کمزور آواز میں کہا ۔

گل نے اس کا کوئی جواب نہ دیا ۔

اس نے فوراً اپنا ہاتھ لاچی کے بازو سے ہٹا لیا ۔

لاچی نے اپنے بازو کو دیکھ کے گل سے کہا ۔

دیکھتے نہیں ہو ۔ تم نے اپنے ناخن اس میں گڑا دیئے ہیں جنگلی واقعی لاچی کے سنہری صندل بازوؤں پر ناخنوں کے گڑ جانے سے سرخ سرخ نشان پڑ گئے تھے ۔ اور ان میں خون جھلک رہا تھا ۔ اس خون کو دیکھ کر گل بے تاب ہو گیا ۔ اس کا جی چاہا کہ وہ لاچی کو اپنے بازوؤں میں اس طرح لے کر اس کی سانس رک جائے ۔ وہ لاچی کی طرف بڑھتا بڑھتا رک گیا ۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بالوں کو پکڑ لیا اور انہیں زور زور سے جھٹکے دیئے ۔ پھر پلٹ کر گل کی طرح لاچی سے کچھ کہے بغیر پل کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا ۔

لاچی ہنسی ۔

آہستہ سے ہنسی ۔ پھر زور زور سے ہنسی ۔ پھر بالکل ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔

بھاگتے بھاگتے گل کو ایسا محسوس ہوا جیسے لاچی اپنے جسم اور روح کی حقارت آمیز ہنسی سے اس پر وار کر رہی ہو۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا ریل کی پٹریاں پھلانگتا ہوا یارڈ کے دوسری جانب گم ہوگیا۔ جہاں ایک مال گاڑی کتنے دنوں سے گھاس کے گٹھے لادے جانے کا انتظار کر رہی تھی یکایک لاچی ہنستے ہنستے چپ ہوگئی پھر آہستہ سے اپنا وہ بازو اُٹھایا جس پر گل کے خنوں کے سُرخ سُرخ نشان تھے۔ یہ ہلالی کے سے نشان۔ جس پر کسی کی امیدوں کا خون تھا۔ لاچی کو یکایک بہت پسند آگئے۔ اس نے جُھک کر اُن نشانوں کو اپنے ہونٹوں سے چوم لیا اور بولی۔

میرزخم۔ میرے پیارے زخم۔ میرے ننھے منے تارک۔ ناتواں سے زخم۔ اس کے بعد وہ اپنے خیمے میں جا کے بہت اطمینان سے سوگئی۔ بے خوف وخطر۔ ایسی گہری نیند میں مستغرق سوئی کہ جب صبح اُٹھی تو دھوپ خیمے کے اندر آچکی تھی۔ اور چچا مامن چٹائیاں بُن رہا تھا۔ اور اس کی ماں خیمے کے باہر روٹی پکانے میں مصروف تھی۔

دوسرے دن لاچی نے رات دو بجے تک گل کا انتظار کیا۔ لیکن اسے پُل پر کوئی سایہ نظر نہ آیا۔ تیسرے دن اس نے پھر انتظار کیا۔ لیکن گل پھر کہیں اسے دکھائی نہ دیا چار دن اور انتظار کرنے کے بعد لاچی نے بھی اس واقعے کو اپنا دل سے بھلا دیا۔ اس کے زخم اب بھر گئے تھے۔ اور ان پر بھورے بھورے کُھرنڈ آگئے تھے۔ لاچی نے اپنے ناخنوں سے دھیرے دھیرے اُن کُھرنڈوں کو صاف کر دیا۔ اب اندر سفید چکنی اور لال جلد نکل آئی تھی۔ جسے دیکھ کر اس کے دل میں پھر انھیں چومنے کی خواہش بیدار نہ ہوئی۔ بلکہ ایک طرح کی نفرت اور کراہت سے اس کا دل بھر گیا۔ اور جب اس کی ماں نے اس سے پُوچھا۔ یہ نشان کیسے ہیں۔

تو اس نے بڑی نفرت سے جواب دیا۔ ایک کتّے کے دانتوں کے نشان ہیں۔ اس کی ماں نے اسے ایک لمحے کے لئے غور سے دیکھا اور چپ ہو کر رہ گئی۔

اگلے بیس دنوں میں لاچی نے دمارد کے ستّر روپے ادا کر دیئے۔ بھیک مانگ کے اور چوری کر کے مگر اب دن بدن اس لئے یارڈ سے کوئلہ چرانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اور مُرغیاں

تو ہر روز پکڑی نہیں جاسکتیں ۔ ریلوے کوارٹروں والے بھی ہوشیار ہو گئے تھے ۔ کیوں کہ لاچی کا قصہ سارے علاقے میں مشہور ہو چکا تھا ۔ جب وہ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف سے گزرتی تو حمید اس کی طرف گھور کے اپنے ساتھیوں سے کہتا ۔

وہ ساڑھے تین سو کی لونڈیا جا رہی ہے ۔

لاچی اگر اس پر بھی چپ رہتی تو کہتا ۔

ہم سے کہو تو ہم ساڑھے تین سو کیا ۔ ساڑھے تین ہزار اس کے قدموں پر لا کر پھینک دیں گے ۔

اگر اس پر وہ خاموش رہتی تو وہ کہتا ۔

ہماری اگر سُنے تو ہم ساڑھے تین ہزار کیا ۔ ساڑھے تین لاکھ اسے دلوا دیں ۔ چاہیں کسی فلم میں ہیروئن بنا دیں ۔ مگر اپنی ایک شرط ہے ۔

اس پر تنگ آ کے لاچی اس کی طرف دیکھ کے تھوک دیتی ۔ اس پر ٹیکسی ڈرائیوروں کا گروہ ٹھٹھا مار کے ہنس پڑتا ۔ اور لاچی غصے میں تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی وہاں سے بھاگ جاتی ۔ اب اس نے ٹیکسی اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر بھیک مانگنا بند کر دیا ۔ کوئی ایک دو ہوتے تو ان کی باتوں کا جواب دے دیتی ۔ مگر اب معاملہ اس قدر صاف تھا ۔ شرط اس قدر کھلی ہوئی تھی کہ ہر کس و ناکس اس کا مذاق اڑانے پر تل گیا تھا ۔ جس سطح کی زندگی لاچی گزارنے پر مجبور تھی ۔ اس سطح پر اتر کر کوئی شخص یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ لاچی اپنے آپ کو بیچنے کے لئے اتنی شدت سے انکار کرے گی ۔

ارے صاحب یہ خانہ بدوش لڑکیاں ۔ نہ ان کا گھر نہ گھاٹ ۔ نہ ماں کا پتہ نہ باپ کا ۔ کس بوتے پہ کم بخت اُتراتی ہے ۔

ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے لاچی نے دمار دے کوئی شرط نہیں لگائی ہے ۔ سارے علاقے کی غیرت کو چیلنج کیا ہے ۔ ہر وہ شخص بھی جسے اس سے پہلے لاچی میں کسی طرح کی دلچسپی نہ تھی اب یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح لاچی اپنی شرط ہار جائے ۔ اپنی عزت کھو دے ۔ دل کی بات زبان پہ

نہ آتی تھی۔ لیکن اکثریت کی عزّت کا تقاضا ہی تھا کہ اس ذلیل خانہ بدوش لڑکی کی عزّت چھن جائے یہ حرامزادی کیا کھا کے ہماری گھر کی عورتوں کی برابری کرنا چاہتی ہے ۔

اس لئے اب بہت سے لوگ جو اس سے پہلے اس سے مذاق کیا کرتے تھے اور اپنا دل خوش کرکے اسے دو چار آنے دے دیں اب دیدہ دانستہ اسے بھیک نہ دیتے تھے کئی تو صاف صاف برملا اس سے کہہ دیتے ۔

بھاگ کے بعد دیں گے ۔ وہ دن تو آنے دو ۔ پھر دو آنے کیا دو سو روپے لے لینا۔

لاچی خوب جلی کٹی سُناتی ۔ وہ خوب مزہ لیتے ۔ لیکن ایک پائی بھیک اسے نہ دیتے یہ علاقہ کی عزّت کا سوال تھا ۔ اور عزّت سب کی سانجھی ہوتی ہے ۔ ہوتی ہے نا جی ۔ آخر ایک گھر کی عورت میں اور ایک گلی گلی بھیک مانگنے والی ۔ ٹوکریاں بُن بُن کر بیچنے والی خانہ بدوش لڑکی کی عزّت میں کچھ فرق تو ہونا چاہیئے ۔

ایک روز لاچی کوئلہ چُراتے چُراتے پھر عین موقع پر پکڑی گئی ۔ ان دنوں یارڈ سنتری دن میں بہت چکّر لگاتے تھے ۔ اور خاص طور پر لاچی پر نگاہ رکھتے تھے اس لئے لاچی نے دن کو کوئلہ چُرانا چھوڑ دیا تھا ۔ اب وہ رات کی تاریکی میں کوئلے کے انبار پر چھاپہ مارتی تھی ۔ یہاں سینکڑوں من کوئلہ رکھا تھا ۔ چند سیر اس میں اگر کوئی چُرائے گا تو کسی کا کیا بگڑ جائے گا ۔ لاچی جس ماحول میں تھی اتنی سی چوری کو چوری نہ سمجھتی تھی ۔ وہ دن دہاڑے کوئلہ چُرالیتی ۔ مگر کیا کرے ۔ پولیس کے سنتریوں کی آنکھوں میں دھول جھونکے سکے کیسے کوئلے کے ڈھیر تک پہنچ جائے ۔ رسک لال اسٹیشن ماسٹر نے تنگ آکے حکم دیا تھا کہ اگر لاچی کبھی ریل کے یارڈ میں داخل ہو تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔

رات کی تاریکی میں آج جب لاچی کوئلہ چُرانے کے لئے دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور جب اس نے بہت سا کوئلہ اپنے دامن میں بھر لیا تو کسی نے آکے اُسے پیچھے سے پکڑ لیا ۔ لاچی کے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی ۔ اس نے دیکھا ۔ یارڈ سنتری دتو اپنے لمبے دانت نکال کر اس پر ہنس رہا تھا ۔

چل اسٹیشن ماسٹر کے پاس۔

چھوڑ دے مجھے۔ لاچی نے بڑی لجاجت سے کہا۔ اب کوئلہ نہ چراؤں گی۔

چلتی ہے کہ میں لات جماؤں۔ دتو نے رائفل کا ایک ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

اسے سے کیا۔ چند سیر تو کوئلہ ہے سب خانہ بدوش لڑکیاں لے جاتی ہیں۔ تیرے ریلوے کے کوارٹروں کے سارے نوکر لے جاتے ہیں۔ میں نے لے لیا تو کیا غضب کیا۔

خود اسٹیشن ماسٹر کے گھر میں یہ کوئلہ جلتا ہے۔ میں جانتی نہیں ہوں کیا۔ میں نے کون سا ایسا غضب کر دیا ہے۔ ہے دتو میں کچھ نہیں جانتا۔ تجھے اسٹیشن ماسٹر کے پاس چلنا ہوگا۔ لے میں تیرا کوئلہ یہیں پھینکے دیتی ہوں۔

لاچی نے کوئلوں سے بھرا دامن وہیں ڈھیر پر الٹ دیا اب مجھے جانے دو۔

دتو نے خوف دلانے کے لئے رائفل سیدھی کی۔ بولا۔ اگر نہیں چلے گی تو ابھی گولی مار دوں گا۔

دھیرے دھیرے سر جھکائے لاچی دتو کے ساتھ چلنے لگی۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ تین بجے گورنر صاحب کا اسپیشل اسٹیشن سے گزرنے والا تھا۔ اس لئے رسک لال ابھی تک گھر نہ گیا تھا۔ اسٹیشن کا سارا اسٹاف چوکس تھا اور اپنی اپنی ڈیوٹی پر کیل کانٹے سے درست ہو کر کھڑا تھا۔ وہ ٹیلیفون پر بیٹھا جنکشن سے گورنر صاحب کی اسپیشل کے بارے میں ہدایت حاصل کر رہا تھا۔ اس نے ایک نظر دتو رام اور لاچی کی طرف دیکھا۔ جو آج سہمی سہمی سی ایک کونے میں کھڑی تھی اس نے ہاتھ کے اشارے سے دتو کو نکل جانے کے لئے کہا۔ دتو کمرے سے باہر نکل کے کھڑا ہو گیا۔

جب رسک لال ٹیلیفون کر چکا تو وہ دھیرے سے لاچی کی طرف مڑا۔ اور اس سے بہت سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا۔

ادھر آؤ۔

لاچی ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی بے بسی میں ایک عجیب سی کشش تھی رسک لال کا دل پگھل گیا۔ اس نے بہت نرمی سے کہا۔

تو تو بہت اچھی لڑکی ہے ۔ پھر کیوں کوئلہ چراتی ہے ۔

لاچی نے بڑی نرمی سے کہا ۔ اسٹیشن ماسٹر صاب اب نہیں چراؤں گی ۔ اب بس معاف کر دو ۔

مگر ایسا کام کیوں کرتی ہے ۔

تم تو جانتے ہو صاب ۔ سارا علاقہ جانتا ہے ۔

وہی ساڑھے تین سو کا قصہ ۔؟

ہاں ۔

کہہ کر لاچی نے نگاہیں نیچی کر لیں ۔

کتنے روپے ادا کر چکی ہے ۔

اتنی ۔

لاچی سر سے پاؤں تک ایسی شرمائی مجوب ندامت میں ڈوبی کھڑی تھی کہ رسک لال کو اس پر بے حد پیار آیا ۔ اس نے اپنی میز کے دراز کو دو ایک بار کھولا ۔ بند کیا ۔ کھولا پھر بند کیا ۔ آخر کھول کر کچھ نوٹ نکالے ۔ اور انہیں لاچی کے ہاتھ میں دے کر بولا ۔

لے ۔ لے جا انہیں اور دے دے اس خبیث کو ۔

لاچی جیسے شکر کے بار سے دب گئی جھک گئی ۔ اس نے جھک کر رسک لال کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا ۔ اور جوں ہی اوپر اٹھی وہ رسک لال کی بانہوں میں تھی رسک لال کے دبلے پتلے ۔ مجوسے ترسے چہرے پر اس نے جذبے کی لرزش دیکھی ۔ وہی رنگ ۔ وہی ادا وہ لالچ ۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ رسک لال کے بھیس میں مادھولال کے پسینے کو دیکھ رہی ہے ۔ وہ لجلجی سی چکنا ہٹ وہی رینگتے ہوئے کیڑے کی سی کلبلاہٹ ۔ لاچی کے دل میں وہی کراہت آمیز نفرت پیدا ہوئی ۔ رسک لال لاچی کے چہرے کی طرف جھکا ہی تھا کہ لاچی نے تڑپ کر ایک ہی جھٹکے میں رسک لال کی بانہوں سے اپنے آپ کو الگ کر لیا ۔ اس کے گال پر ایک زور کا طمانچہ دیا ۔

کہ رسک لال کُرسی سے ٹھوکر کھاتا ہوا زمین پر جا گرا۔ اور زمین پر گرتے ہی شور مچانے لگا۔

پولیس ! پولیس !!

دتو فوراً دوڑتا ہوا اندر آیا۔

اسے دیکھ کر رسک لال کی دلیری عود کر آئی۔ وہ زمین سے اٹھا اور چلا چلا کر کہنے لگا۔ اس حرامزادی کو حوالات میں لے جا کر بند کر دو۔ یہ کم بخت کو ئلہ چُراتی ہے ہمارے یارڈ سے۔

لاچی فوراً ترکی بہ ترکی بولی۔ اور تم جو کچھ چُرا رہے تھے مجھ سے۔ بُڈھے۔ جھڑوس۔ شرم نہیں آتی۔ تیری بیٹی کے برابر ہوں۔ لے جاؤ۔ اسے لے جاؤ اور حوالات میں بند کر دو۔ رسک لال آگ بگولا ہو کے بولا۔

لاچی آگے بڑھ کے اپنے بازو چلاتے ہوئے بولی۔ ٹھہر تو جا۔ ابھی تیری کھال نوچ لوں گی۔ لیکن دتو لاچی کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گیا۔ اور اس نے لاچی کو اسٹیشن کے حوالات میں بند کر دیا۔

ساتواں باب

تین دن حوالات میں بند رہنے کے بعد چوتھے دن حوالات کے سنتریوں نے لاچی کو اسٹیشن ماسٹر کے حکم سے حوالات کے باہر دھکیل دیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے جب لاچی حوالات کے باہر آئی تو گل اسے لینے کے لئے کھڑا تھا۔

لیکن یہ گل کوئی دوسرا گل تھا۔ اور اس پر دھول اور گرد کے نشان تھے۔ وہ پٹھان قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔ قمیص کے اوپر سیاہ جاکٹ اور سر پر لنگی اور کلاہ اور سیاہ جیکٹ کے اُوپر اس نے ایک چرمی پٹہ پہن رکھا تھا۔ جس سے بندھی ہوئی چقماق کی ایک چرخی اس کی پیٹھ پر آویزاں تھی۔ اور آگے پٹہ کی گرہوں میں چاقو اور چھریاں اور قینچیاں لٹک رہی تھیں۔

یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تو نے۔ لاچی نے بڑی حیرت سے پوچھا میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔

کیوں نکال دیا ہے۔

جب میں نے تیرے لئے پیسے مانگے تو آغا جی بہت خفا ہوئے۔ بولے۔ قوچی کا بیٹا ہو کر اک آوارہ خانہ بدوش لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ میں تیرے لئے ساڑھے تین سو کیا۔ تین روپے بھی نہیں دے سکتا۔ نکل جا۔ اس وقت نکل جا میرے گھر سے یہ کہہ کر وہ اپنا ڈنڈا لے کر

میرے پیچھے دوڑے میں گھر سے بھاگ آیا۔

پھر اتنے دن کہاں رہے ؟ اس دن پل پر کیوں نہیں آئے کیا مُنھ لے کے آتا۔ سوچا تھا۔ رقم اکٹھی کر لوں گا آ کے تیری ہتھیلی پر دھر دوں گا۔ اس کے لئے میں دو تین جگہ نوکری کرنے کی کوشش بھی کی۔ اِدھر میونسپل کمیٹی میں ایک کلرک کی اسامی خالی تھی۔ مگر وہ لوگ بولے تم اِدھر کے باشندے نہیں ہو۔ تمھیں یہ نوکری نہیں مل سکتی۔ کسی نے کہا تم پٹھان ہو۔ کسی نے کہا تمھیں دیکھ کے ڈر لگتا ہے۔ اب میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں ؟ اس موقعے پر باندہ والے عبدالصمد خاں نے جو ہماری برادری کا ہے۔ میری یہ مدد کی ہے۔ اس نے مجھے اس دھندے پر لگا دیا ہے۔ دو ڈھائی روپے روز ہو جاتے ہیں۔ میں نے تیرے لئے تیس روپے جمع کئے تھے۔

کہاں ہیں وہ تیس روپے۔ لاچی نے خوش ہو کے ہتھیلی آگے بڑھائی۔

گل نے سر جھکا کے کہا۔ وہ تو خرچ ہو گئے۔

خرچ کر دیئے تونے۔ لاچی چیخ کر بولی۔

رسک لال کو دے دیئے۔ نہ دیتا تو حوالات سے تجھے باہر کیسے نکالتا۔

لاچی پلیٹ فارم کے ننگے فرش پر بیٹھ گئی۔ سامنے یارڈ کی فولادی پٹریاں بے روح سنگ دل اور جذبات سے عاری۔ ان پٹریوں سے پرے ریلوے کا جنگلا جنگلے سے پرے ریلوے کے کوارٹر تھے۔ کوارٹروں سے پرے خانہ بدوشوں کے خیمے تھے خیمے کے پرے درختوں کی ننگی قطاریں تھیں۔ وہ تیز تلواروں کی طرح ننگی شاخیں جیسے اس کی گردن پر لٹک رہی تھیں۔ جس دن ان شاخوں پر پھول آئیں گے۔ جس دن ان شاخوں پر۔

لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ان شاخوں پر پھول نہ آئیں۔ روپوں کے سفید سفید پھول کھلیں جنھیں توڑ توڑ کر وہ دلدار کا دامن بھر دے۔ ان شاخوں پر آخر پھول کیوں اُگتے ہیں۔ روپے کیوں نہیں اُگتے۔ صرف ایک ہی بہار میں ایسا ہو جائے۔

لاچی دھیرے سے اُٹھی اور یارڈ سے گزرنے لگی۔ گل اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

دونوں کے قدم بے اختیار پرانے پُل کی طرف بڑھنے لگے۔ پُل کے اُوپر پہنچ کر وہ دونوں نااُمید اور مایوس ہو کر خلا میں دیکھنے لگے۔

وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

کہیں بھی کچھ نہ تھا۔

گل نے اپنی مٹھیاں کس لیں۔ بولا۔

ابھی بہار میں بہت دن ہیں۔ میں ہوتے ہوتے تیرا قرضہ چکا دوں گا۔

مجھے ان ننگی شاخوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ روز صبح اُٹھ کر انھیں دیکھتی ہوں۔ کہیں ان میں سے آنکھیں تو نہیں نکل آئیں۔ کہیں ان میں کوئی پتی تو نہیں پھوٹی۔ کہیں کوئی کلی تو نہیں شرمائی۔ مجھے بہار کی آمد سے بہت ڈر لگتا ہے۔

خدا کرے بہار کبھی نہ آئے۔ گل نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

وہ دونوں چپ ہو گئے۔

یکایک گل ہنسنے لگا۔ کیوں ہنستے ہو؟ لاچی اس کی طرف حیرانی سے دیکھ کر بولی۔

ان دنوں میں بے ایمانی کرتا ہوں۔

کیا بے ایمانی کرتے ہو۔ کوئلہ چُراتے ہو۔

نہیں۔ جب میں گھروں میں جاتا ہوں اور لوگ مجھے اپنی چھُریاں چاقو تیز کرنے کے لئے دیتے ہیں تو میں انھیں صرف ایک طرف سے تیز کرتا ہوں۔

کیوں۔

تاکہ چھُریاں چاقو جلد کند ہوں اور لوگ پھر میرے پاس آئیں۔

لاچی زور زور سے ہنسنے لگی۔

اسے گل کی یہ شرارت بہت پسند آئی۔ یکایک گل اسے اپنا ساتھی اپنی طرح کا محسوس ہوا۔ وہ اپنی دھن میں اس کے قریب چلی گئی۔ ہنستے ہنستے یکایک رُکی۔ بولی اپنا ہاتھ دکھاؤ۔

گل نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

لاچی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا۔ اپنے ہاتھوں سے دبایا۔ خوش ہو کر بولی۔ ہاں کچھ فرق پڑا ہے۔

کیا فرق پڑا ہے۔ گل نے حیرت سے پوچھا۔

یہ ہاتھ نرم تھے۔ اب سخت ہو گئے ہیں۔

گل چپ رہا۔

لاچی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بولی۔

اب تمھارے چہرے پر مٹی ہے۔ داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔ بابوؤں کی طرح تمھارا چہرہ صاف اور چمکیلا نہیں رہا۔

گل نے احتجاجاً کہا۔ کیا کروں میرا کام ہی ایسا ہے۔ دن بھر گھومنا پڑتا ہے۔ اب میں کل سے شیو کر کے آؤں گا۔

شیو کر کے مت آنا۔ لاچی سختی سے بولی۔ مجھے تمھارا یہ الجھا ہوا بڑھی ہوئی داڑھی والا چہرہ پسند ہے۔

گل کا ہاتھ لاچی کے ہاتھ میں کانپا۔ جیسے پرندہ انجانے گھونسلے میں آشیانے کے تنکے ٹٹولے اور گھونسلے کو آرام دہ پاکر اپنے پر ڈھیلے چھوڑ کر بیٹھ جائے۔ اس طرح گل نے اپنے ہاتھ کو لاچی کے ہاتھ میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے دل میں ایک میٹھی سی لہر کہیں سے آئی۔ اور اس کی روح کے ذرے ذرے کو نغمے اور سرور و شاداب کرتی چلی گئی۔ اور ایک سکون آمیز طمانیت سے اس کا دل سرشار ہو گیا۔ لاچی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اس کی طرف مڑی اور گل کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

گل۔

ہاں۔

تم مجھ سے پیار کرتے ہو۔

ہاں۔

مجھ سے شادی کروگے۔

ہاں۔

مجھے ایک گھر دوگے۔

ہاں۔

تم میرے لئے بس کے کیو میں کھڑے ہو کر میرا انتظار کروگے۔

ہاں۔ مگر تم یہ سب کیوں پوچھتی ہو۔

بس مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ لاچی ایک گہری طمانیت کی آہ بھر کے بولی۔ اور کچھ نہیں چاہئے۔ لاچی کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کا سارا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ بے اختیار گل کے سینے سے جا لگی۔

گل نے گھبرا کر کہا۔ سارا یارڈ دیکھ رہا ہے لاچی سارا یارڈ دیکھ رہا ہے دیکھنے سارا یارڈ کیا۔ ساری دنیا دیکھے۔ میں تیری ہوں۔ لاچی نے مکمل طمانیت سے کہا اور اس کے بازو گل کے گلے میں حمائل ہو گئے۔ گل نے جھک کر لاچی کی آنکھوں کی سبز جھیلوں میں دیکھا۔ وہاں دور دور تک مسرت کے پھول کھلے تھے۔

گل نے لاچی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اور اس کے ہونٹ لاچی کے کنوارے ہونٹوں پر جھک گئے۔

پل کے نیچے ۱۵ ڈاون شور مچاتی ہوئی گڑگڑاتی ہوئی گزرنے لگی۔ اس کی سیٹی کی دلکش آواز لاچی اور گل کے دلوں میں مسرت کی گھنٹیاں بجاتی ہوئی گونج گئی۔ کورو۔ کورو۔ جیسے چہکتی ہوئی کوئل فضا میں لہرا کے گزر جائے۔

ہری جھنڈی ہلی۔ سگنل اٹھے اور محبت میں بے بس عورت کے بازوؤں کی طرح گر گئے۔

کانٹے والے نے کانٹا بدلا۔ اور عورت کی روح اپنی پرانی لائن کو چھوڑ کر نئی لائن پر بھاگتی چلی گئی۔ نیا سفر۔ نئی منزل۔ نئے راستے۔ ان پوچھے۔ ان جانے راستے جو زندگی کی نئی وادیوں کو جاتے ہیں۔

اس واقعہ کے پندرہ بیس روز بعد ایک آسمانی رنگ کی پلائی متھ دمارد کے خیمے کے قریب کی سڑک پر رکی۔ جوائر پورٹ کو جاتی تھی اس میں سے نیم بھورے رنگ کا ریان جھلملاتا ہوا سوٹ پہنے ایک بانکا جوان نکلا۔ اس کے ہاتھ میں تھری کاسل کا ڈبہ تھا۔ انگلی میں بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ اور ٹائی پر بھی ایک لعل جگمگا رہا تھا۔ دمارد نے اسے جھک کر سلام کیا۔

نوجوان نے دمارد سے پوچھا۔

ابھی اور کتنے دن مجھے انتظار کرنا پڑے گا۔

بہار آجائے۔ ——— دمارد نے بڑی حسرت سے درختوں کی ننگی شاخوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بہار تو دو ماہ میں بھی نہ آئے گی۔

نہیں بابو۔ اب کے بہار جلد آئے گی۔

تب تک وہ شاید سارے پیسے چکا دے گی۔

کیسے چکا دے گی۔ یہ ناممکن ہے بابو۔ ان بیس دنوں میں اس نے مجھے صرف پچاس روپے دیئے ہیں۔

لیکن وہ ادا کر دے گی۔ حمیدا مجھ سے کہتا تھا۔ چاقو چھریاں تیز کرنے والا پٹھان ہر روز اسے پیسے دیتا ہے۔ وہ روز رات کو پُل پر ملتے ہیں۔

میں جانتا ہوں بابو۔

تم خاک جانتے ہو۔ وہ نوجوان جھلا کے بولا۔ سالی دو پیسے کی چھوکری اور اتنی اکڑفوں۔ تم سے کچھ نہیں ہوتا تو مجھ سے صاف کہہ دو۔ سالی پر غنڈے چھوڑ دوں گا۔ دو منٹ میں اسے اغوا کر کے میرے پاس پہنچا دیں گے۔ ذرا تو بات ہے۔

اب دیر بھی ذرا سی ہے بابو۔ دمارد لجاجت سے بولا۔ بہار کو آنے دو۔ یہ شگوفہ خود بخود کھل جائے گا۔

بس باتیں ہی باتیں ہیں تمھاری۔ نوجوان چیں بہ چیں ہوکر بولا۔ اور اپنی کار کی طرف جانے کے لئے مڑا۔ کہ دمارد نے آگے بڑھ کر اس سے بھکاریوں ایسے لہجے میں کہا۔

ایک سو روپے دے جاؤ۔

اب تک چار سو روپے مجھ سے تم لے چکے ہو۔

بس ایک سو اور دے دو۔ پھر بہار آنے تک کبھی نہ مانگوں گا۔

صرف ایک سو روپیہ۔

نوجوان نے اپنا بڑا چرمی بٹوا کھولا۔ اس میں سو سو کے نوٹ ہزاروں ہوں گے۔ دمارد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ نوجوان نے بہت بے پروائی سے اس میں سے ایک نوٹ نکال کے اس کے ہاتھ میں دیا۔ دمارد گھٹنوں تک بار احسان سے جھک گیا۔ دمارد کے فرشی سلاموں کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور بہت نخوت سے سگریٹ پیتا ہوا اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔

دمارد جب سو کا نوٹ لے کر خوشی خوشی اپنے خیمے کو گھوما تو اس نے اپنے سامنے رگی کو کھڑا پایا۔ رگی کی آنکھوں میں شریر مسکراہٹ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا۔ دمارد نے اسے دیکھ کر جلدی سے سو روپے کا نوٹ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اور رگی سے نگاہیں چرا کر اپنے خیمے کو جانے لگا۔ کہ رگی نے اس کا راستہ روک لیا۔

کیا ہے۔ دمارد نے بڑا غصے میں کہا۔

یہ کون تھا؟

چمن بھائی تھا۔ کرلا روڈ پر اس کا پلاسٹک کا کارخانہ ہے۔ اس نے تمھیں سو روپے کا نوٹ کیوں دیا۔

یہ میرا معاملہ ہے۔ تم بیچ میں بولنے والے کون ہوتے ہو؟

میں سب سمجھتا ہوں ۔ میں نے سب سُن لیا ہے ۔ اب میرا حصہ نکالو ۔ میری بیٹی کا سودا کرنے والے تم کون ہوتے ہو رگی نے دمارد کا گریبان پکڑ لیا ۔

اسے چلّامت دمارد نے بہت چالاکی سے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا ۔ میں تمھیں حصہ بھی دیتا ہوں اور حصہ سے بھی زیادہ دیتا ہوں ۔

تو دو ۔

میرا گریبان تو چھوڑ دو ۔

رگی نے ہاتھ پرے ہٹا لیا ۔

دمارد نے اپنی جیب ٹٹول کر اس میں سے ایک دس کا نوٹ نکالا ۔ بولا یہ لو دس روپے ۔ اور دس روپے اور دوں گا ۔ اگر تم میرا ایک کام کر دو گے ۔

کیا کام ہے ۔

دمارد نے غور سے رگی کی طرف دیکھا ۔ پھر کہا ۔

کیا تم چاہتے ہو کہ تمھاری بیٹی ہمارے قبیلے ہی میں رہے ۔

ہاں ۔

وہ کسی ایک گاؤں ۔ کسی ایک شہر ۔ کسی ایک مرد کی ہو کر نہ رہے ۔

ہاں ۔

تو تمھیں میرا کام کرنا ہوگا ۔ میں تمھیں اس کے دس روپے دوں گا ۔

وہ کام کیا ہے ۔ پہلے یہ تو بتاؤ ؟

ادھر میرے قریب آؤ ۔

رگی دمارد کے قریب گیا ۔ دمارد نے جھک کر رگی کے کان میں کچھ کہا ۔ کچھ دیر تک رگی کا چہرہ دمارد کی بات سُن کر پریشان اور متوحش رہا ۔ پھر یکایک اس کا چہرہ صاف اور روشن ہو گیا ۔ اور اس نے دمارد سے کہا ۔

اس کام کے تیس روپے ہوں گے۔

تیس بہت زیادہ ہیں۔ میں پندرہ دے دوں گا۔

پندرہ نہیں لوں گا۔ پچیس لوں گا۔

بڑی ردوکد کے بعد پچیس پر سودا ہوگیا۔

رگّی نے کہا۔ نکالو پچیس روپے۔

ابھی نہیں۔ دمارد ہنس کے بولا۔ میرے یار اپنا کام کرو پچیس روپے لے جاؤ۔ اگر میرا اعتبار نہ ہو تو کہو امن کے پاس رکھوا دوں۔

نہیں۔ امن حرامزادے سے تم حرامزادے بہتر ہو۔

رگّی نے مسکرا کر کہا۔ اور دس روپوں کو جیب میں ڈال کر گنگناتا ہوا چلا گیا۔

آج لاچی نے صرف بارہ آنے کمائے تھے۔ سوا روپیہ گُل نے لا کے دیا تھا۔ اس طرح دو دو روپے کر کے کتنے مہینوں میں قرضہ چکایا جا سکے گا۔ لاچی بار بار خائف ہوکر درختوں کی طرف دیکھتی۔ درختوں کی چھال کا رنگ بدل رہا تھا۔ بھورے بھورے ڈالوں پر ہری ہری لچکیں شاخیں پھوٹی تھیں۔ چند دنوں میں ان پر نرم نرم سبز پتیاں پھوٹیں گی۔ پھر سبز پتیوں کے سرے ہوئے جھومر میں لال لال شگوفے پھوٹیں گے۔ اور گویا میری قسمت پھوٹ جائے گی۔

لاچی کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔

گُل نے اسے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔

گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

میں وقت سے پہلے روپیہ چکا دوں گا۔

دن رات محنت کرتا ہوں۔ ایک فلم اسٹوڈیو میں دربان کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ مالک نے مجھے بلایا ہے۔ پچھتر روپے تنخواہ ہوگی۔ شام کے چھ بجے چھٹی ہوگی۔ چھٹی ہوتے ہی میں چقماق کی برخی لے کر گھومنا شروع کر دوں گا۔ کچھ یہاں سے آئے کچھ وہاں سے آئے گا۔ روپے آ جائیں

گے قرضہ چک جائے گا۔

لاچی کی بشاشت واپس آگئی۔ ایک دم خوش ہو کر بولی۔

پھر۔ پھر۔

پھر ہم اپنا گھر بسالیں گے۔ باندرہ والے عبدالصمد خان نے مجھ سے وعدہ کیا ہے وہ مجھے باندرہ میں ایک کھولی دلا دے گا۔ ہم دونوں اس میں رہیں گے۔

ہم دونوں! لاچی جیسے خوشی سے چیخ کر بولی۔ میرا گھر۔

مگر چھوٹا سا گھر ہو گا ـــــ ہائے میرا گھر۔

لاچی ایک دم گل کے سینے سے لگ کر بولی۔ اس کا ننھا سا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔

ہائے جب تو سچ مچ بہار آجائے گی۔ سچ مچ بہار آجائے گی۔

گل نے لاچی کو اپنی بانہوں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

اچھا تو میں جاؤں۔ رات کو پل پر آؤں گا۔

لاچی آزردہ ہو کر بولی۔ تم ہر روز یہاں سے پیدل باندرے جاتے ہو۔ وہاں سے پیدل رات کو پل پر واپس آتے ہو۔ صرف مجھے دیکھنے کے لئے۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔

لاچی نے اپنی جیب ٹٹول کر اس میں سے چار آنے نکالے۔ اور گل کو دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

بس کا کرایہ۔ آنے جانے کا تو لے جاؤ!

نہیں لاچی۔ گل نے بہت نرمی سے کہا۔ تم چار آنے بھی دھارو کو دے دو۔ قرضے میں سے چار آنے اور کم ہو جائیں گے۔ یہ تو سوچو۔

لیکن تم کتنے تھک جاتے ہو۔

گل ہنس کر بولا۔ جب تم میرے گھر آجاؤ گی پھر تم میرے پاؤں دبا دیا کرنا۔ میری ساری تھکن دور ہو جائے گی۔

پھر میں تمھارے پاؤں دباؤں گی ٹانگیں دباؤں گی ۔ تمھاری پیٹھ ۔ تمھاری کمر ۔ تمھارے ہاتھ تمھاری گردن تمھارا سر دباؤں گی ۔ تمھارے جسم کے گوشے گوشے سے ساری تھکن اپنی باہنوں میں لے لوں گی ۔ میرے گل ۔ میرے گل ۔ لاچی نے گل کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے پر جھکا لیا ۔ گل نے لاچی کو پیار کیا ۔ پھر اس نے چار آنے لاچی کی جیب میں ڈال دیئے ۔ اور رات کو پل پر آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا ۔

آٹھواں باب

ان دنوں لاجی مامن اور اپنی ماں سے زیادہ باتیں نہ کرتی تھی۔ اتنے قریبی رشتے میں اجنبیوں کا سا رکھ رکھاؤ آگیا تھا۔ کم سے کم باتیں ہوتی تھیں اور غیریت کے پردے میں ہوتی تھیں۔ لاجی اپنے خیمے میں پہنچتی تھی اور پہنچتے ہی مامن اور اپنی ماں کے لئے کھانا پکاتی تھی۔ برتن صاف کرتی۔ خود کھانا کھاتی۔ پر جب سونے کا وقت آتا چٹائی لے کر خیمے کے اندر سو جاتی۔ رات دو بجے تک یا تو جاگتی رہتی یا اگر سو جاتی تو رات کے دو بجے خود بخود اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ بھاگ کر پل پہنچتی۔ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ دور ہی سے اس نے دیکھ لیا کہ پل پر رات کی تاریکی میں ایک دھندلا دھندلا سا سایہ کھڑا ہے۔ محبت اور شوق سے اس کے قدم تیز ہو گئے۔ اور وہ جلدی جلدی پل کے اوپر پہنچی۔ لیکن وہاں پہنچ کر جب وہ سایہ اس کی طرف مڑا تو وہ اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ یہ گل نہ تھا۔

دبلے پتلے بدن والا سوکھے گالوں والا۔ چھوٹے ناٹے قد کا۔ کانٹے والا رامو تھا۔

رامو! لاجی زور سے چلائی۔ تم یہاں کیسے۔ پھر اک دم گھبرا کے بولی۔

گل کہاں ہے۔

ہسپتال میں ہے۔

رامو رک رک کے بولا۔

ہسپتال میں! لاجی حیرت سے بولی۔ پھر اس کی زبان خود بخود بند ہو گئی۔ وہ آگے کچھ نہ بول

سکی ۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے راموکو دیکھنے لگی ۔

راموآہستہ سے بولا ۔

وہ یہاں سے باندرے سے پیدل جا رہا تھا ۔ ارلا کے موڑ پر جہاں سڑک کے کنارے کنارے بڑے بڑے آدمیوں کے بنگلے ہیں ۔ اور بہت بڑے بڑے جھاڑ ہیں ۔ ادھر سے ایک آدمی نکلا اور اس نے پیچھے سے آکے چھرا گل کی پیٹھ میں بھونک دیا ۔

ہائے ! لاچی نے اپنا ہاتھ اپنے منھ پر رکھ لیا ۔

گل نے اسے پکڑنا چاہا ۔ مگر رات کی تاریکی میں وہ آدمی اپنا دامن چھڑا کر بھاگ کر درختوں میں گم ہو گیا ۔ گل خون میں لت پت سڑک پر لوٹنے لگا ۔ اتفاق سے میں اسی وقت اپنے گھر جا رہا تھا ۔ میں ارلا میں رہتا ہوں نا ۔ جھونپڑیوں میں جدھر بجلی والوں کا دفتر ہے اس کے پیچھے ۔ میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا ۔ کہ راستے میں کسی کے کراہنے کی آواز سنی ۔ پلٹ کے دیکھا تو گل تھا ۔

زمین پر لوٹ رہا تھا ۔ میں نے اسے اٹھایا ۔ راستے میں گزرتی ہوئی ایک لاری کو روکا ۔ اور اب اسے باندرے کے ہسپتال میں پہنچا کے ادھر تمھاری طرف آیا ہوں ۔ مجھ سے گل نے کہا تھا ۔ تو مجھے یہاں ملے گی ۔

لاچی نے گھبرا کے پوچھا ۔ اس کا کیا حال ہے ۔

راموبولا ۔ اس کے جسم سے خون تو بہت گیا ہے ۔ مگر ڈاکٹر بولتے تھے ۔ وہ بچ جائے گا ۔

تو مجھے جلدی ہسپتال لے چل !

راموتھوڑی دیر کے لئے جھجکا ۔ پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا ۔ اور اس میں سے پندرہ روپے نکالے ۔ اور انھیں لاچی کو دیتے ہوئے بولا ۔ انھیں اپنے پاس رکھ لے !

کاہے کے لئے ۔ لاچی حیران ہو کے بولی ۔

رامونے سر جھکا کے کہا ۔ مجھے تیرا قصہ معلوم ہے ۔ میں جانتا ہوں محبت کیا ہوتی ہے ۔ میری بھی ایک لڑکی تھی ۔ تیری اتنی بڑی ۔ ایک دن رسک لال نے اس کی محبت لے لی تھی ۔ وہ

چُپ ہوگیا۔

دیر تک چُپ رہا۔ پھر رُندھے ہوئے گلے سے بولا۔ اگر میں کچھ کرتا تو میری نوکری جاتی تھی۔

وہ پھر چُپ ہوگیا۔ پھر آہستہ سے۔ بہت دھیرے سے بولا میں جانتا ہوں عزت کیا ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا۔ شرم سے جیسے زمین میں گڑ گیا۔

نہیں نہیں میں یہ روپے نہیں لوں گی۔ لاچی آبدیدہ ہوکر بولی۔ تیری لڑکی کہاں ہے۔

کنوئیں میں ڈوب کر مرگئی۔ رامو منہ پھیر کر خلا میں دیکھنے لگا۔

لاچی دم بخود رہ گئی۔ کتنا بڑا خلا ہے۔ اس دُنیا میں۔ کتنا بڑا کنواں، کتنا گہرا۔ کتنا سیاہ۔ کتنا اندھا ہے یہ دُنیا کا کنواں! ہر روز ہزاروں عزتیں اس میں ڈوب کر مر جاتی ہیں اور پھر بھی یہ بھوکا کنواں نہیں بھرتا۔

یکایک رامو نے لاچی کا دامن پکڑ کر کہا۔

میں تجھے اگلے مہینے کی تنخواہ پر دس روپے اور دوں گا۔ مگر دیکھنا۔ کبھی بھی اپنی عزت نہ بیچنا!

لاچی کا دل چاہا کر وہ بڑھے رامو کے شانے پر سر رکھ دے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور اسے باپو باپو کہہ کر پکارے۔ لیکن اس نے بہت مشکل سے اپنے آنسوؤں کو پی لیا اور آہستہ سے بولی۔ مجھے ہسپتال لے چلو۔

گل کو ہسپتال میں ڈیڑھ ماہ کے قریب رہنا پڑا۔ دھیرے دھیرے اس کا زخم مندمل ہوتا گیا دھیرے دھیرے اس کے دل کا زخم کھلتا گیا۔ وہ ہر لحظہ یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا تھا۔ اب کیا ہوگا۔ اب کیا ہوگا۔ دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ ہر لحظہ بہار قریب آتی چلی جا رہی تھی۔ اور وہ بستر پر پڑا تھا۔ لاچی ہر روز ہسپتال آتی۔ دونوں وقت جب ہسپتال تیمارداروں کے لئے کھلتا تھا۔ اور اس کے لئے اپنی کمائی میں سے پھل خرید کے لاتی تھی۔

اُس نے سبزی مارکیٹ میں سبزی بیچنے والی ایک بڑھیا کے ہاں نوکری کر لی تھی۔ بڑھی کمزور ہو چکی تھی۔ اور اب اس سے سبزی کی ٹوکری سر پر اُٹھائے گلی گلی گھومانہ جاتا تھا۔ لیکن اس کے لگے بندھے گاہک تھے جو اسی سے سبزی خریدنا پسند کرتے تھے۔ اور بڈھی کا گھر بھی اسی سبزی بیچنے سے چلتا تھا۔ اور پھر اس کے گاہک اسے وقت پر پیسہ دیتے تھے۔ اس لئے اس نے لاچی کو اپنے ہاں نوکر رکھ لیا۔ اور ہر روز اپنی آمدنی میں سے ایک تہائی اسے دینے لگی۔ اسی کاروبار سے لاچی کو ہر روز سوا روپیہ ڈیڑھ روپیہ مل جاتا تھا۔ مگر اتنے کے تو گُل کے لئے پھل ہی آجاتے تھے دمارد کو دینے کے لئے کچھ نہ بچتا تھا۔ کبھی کبھی تو بس کے آنے جانے کا کرایہ بھی بھاری پڑ جاتا۔ اس وقت لاچی بھی وہی کرتی جو گُل کا شیوہ تھا۔ کیوں کہ شیوہ عاشقی میں مرد اور عورت کی تفریق کہاں! اپنے محبوب کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

لاچی کو اس کاروبارِ عشق میں ایک نئی لذت محسوس ہوئی۔ گُل جب تندرست تھا کبھی لاچی کو اتنا اچھا نہ لگا جتنا بیمار ہو کر۔ اب ہر لحظہ وہ یہی چاہتی تھی کہ ہر وقت اپنے بیمار محبوب کے قدموں میں بیٹھی رہا کرے مگر ہسپتال کے بھی قانون اور قاعدے ہوتے ہیں۔ گو لاچی کی دلرُبا صورت دیکھ کر اکثر اردلیوں کو رحم آجاتا تھا۔ کیا وارڈر اور ڈاکٹر لوگ بھی اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔ جب وہ آتی تو اردلی جیسے بچھ سے جاتے۔ ڈاکٹر وارڈ میں دو تین بار چکر لگایا۔ اور کبھی ڈیوٹی ڈاکٹر کے ساتھ تین چار ڈاکٹر اور بھی آجاتے۔ بظاہر وہ کوئی دلچسپ کیس دیکھنے آتے تھے۔ لیکن ہسپتال کی نرسوں کو بخوبی معلوم تھا کہ اصلی دلچسپی کہاں پر مرکوز ہے۔ اس لئے ہسپتال کی نرسیں لاچی سے بہت جلتی تھیں اگر ڈاکٹر اِدھر اُدھر کہیں موجود ہوتا تو لاچی کو اوور ٹائم بیٹھنے دیتیں۔ لیکن ڈاکٹر کے دور ہوتے ہی اُسے تحکمانہ انداز میں وارڈ سے باہر چلے جانے کا حکم دیتیں۔ لاچی سب سمجھتی تھی۔ کس کس ہمدردی کے پس پردہ کون سا جذبہ جھانک رہا ہے۔ کس کے نفرت انگیز سلوک کے پیچھے کون سی جلن پنہاں ہے وہ سب سمجھتی تھی۔ اس لئے برداشت کر لیتی تھی۔ دھیرے دھیرے اس نے اپنی گرم لاوا ایسی طبیعت پر جبر کرنا اور جبر کر کے ایک معاف کر دینے والی مُسکراہٹ سے کام لینا سیکھ لیا تھا۔ کیوں کہ جب انسان کسی جذبے کی واہمیت اچھی طرح سے سمجھ لے تو برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اسی اثنا میں ایک دن بلوچی۔ گُل کا باپ صبح سویرے لاچی کے خیمے پر پہنچا۔ جب لاچی سبزی مارکیٹ میں کام پر جانے والی تھی۔ لاچی اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

بلوچی بولا۔ مجھے تم سے کچھ کام ہے۔

لاچی نے کہا۔ مجھے فوراً ہی سبزی مارکیٹ پہنچنا ہے اس وقت رک نہیں سکتی۔

بلوچی نے کہا۔ چلتے چلتے باتیں کرلیں گے۔

لاچی چلتی رہی۔ بلوچی اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ لاچی اس کی باتیں سُننے کے لئے سیلے راستے سے ہولی۔ جو یارڈ کے باہر گھاس کے گٹھوں کے گودام اور کولا روڈ کو جانے والی بسوں کے شیڈ کے قریب سے ہوکر گزرتا تھا۔ جہاں قریب ہی ایک سینما پڑتا تھا اور سینما کے عین سامنے ریلوے کا کراسنگ تھا۔

دونوں نے چلتے چلتے خاموشی سے آدھا راستہ طے کرلیا۔

آخر لاچی بولی۔ تم کچھ بات کرنے آئے تھے۔

تم گُل کو چھوڑ دو۔ یکایک بلوچی کے مُنہ سے نکلا۔

کیوں چھوڑ دوں۔

وہ میرا بیٹا ہے۔ بلوچی تحکمانہ انداز میں بولا۔

وہ میرا پیارا ہے۔ لاچی بڑی نرمی سے سر جھکا کے بولی۔

اگر تم اس سے شادی کروگی تو ساری برادری مجھ پر تھوتھو کرے گی۔

ایک برادری میری بھی ہے۔

تم خانہ بدوشوں کا کیا اعتبار۔ آج یہاں کل وہاں۔ تم یہاں سے چلی جاؤگی تو میرا بیٹا تمھیں بھول جائے گا۔

لاچی خاموشی سے چلتی رہی۔

بلوچی نے اپنے جیب سے ساڑھے تین سو روپے نکالے۔

یہ لے لو۔ اور میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔

نہیں نہیں۔ لاچی بڑی تیزی سے بولی اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔

پچاس اور دیتا ہوں۔ بلوچی نے پچاس روپے اور نکالے نوٹوں کی گڈی ہاتھ میں کانپ رہی تھی۔

لاچی نے اُن نوٹوں کی طرف دیکھا نہیں۔ اور ہاتھ سے جھٹک کے آگے بڑھ گئی۔

بلوچی نے تیزی سے آگے بڑھ کے اسے روک لیا۔

سُنو سُنو! وہ ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔ تم مجھ سے شادی کر لو۔

تم سے شادی۔ لاچی ہکا بکا رہ گئی۔

ہاں! میں! میں تمھیں خوش رکھ سکوں گا۔ گُل کی صحت دیکھو اور میری صحت دیکھو۔ بلوچی اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ میں تمھیں خوش رکھ سکوں گا۔ میرے پاس روپیہ بھی ہے۔ بہت سارا روپیہ۔ اور جب سے ہسپتال میں۔ میں نے تمھیں دیکھا ہے میں پاگل ہو گیا ہوں۔

یکا یک لاچی زور زور سے ہنسنے لگی۔

ہنسی اُسے بے اختیار آ رہی تھی۔

کیوں ہنستی ہو۔ بلوچی برافروختہ ہو کے بولا۔

اس لئے ہنستی ہوں کہ میں باپ اور بیٹے میں سے صرف ایک کے ساتھ شادی کر سکتی ہوں۔

تو مجھ سے شادی کر لو۔ بلوچی بہت بے تابی سے بولا۔ میں حق مہر کے لئے پانچ ہزار روپے لکھنے کے لئے تیار ہوں۔

بے قرار ہو کر بلوچی نے لاچی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لاچی نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور گہرے طنز آمیز لہجے میں بولی۔ تم اپنے بیٹے کی رضامندی مجھے لے دو۔ پھر میں تم سے کیا تیرے دادا سے بھی شادی کر لوں گی۔

یہ کہہ کر لاچی بہت تیزی سے اس کے پاس سے گھومی۔ اور دوڑ کر ریلوے کراسنگ پر تلا نہیں

بھرتی ہوئی نکل گئی ۔

سالی ۔ بلوچی نے دانت پیس کر کہا ۔ تجھ پر کتے نہ چھڑوا دوں تو احمد یار خاں نام نہیں ۔

لاچی نے سن لیا ۔ اور وہیں کراسنگ سے پلٹ کر بلند آواز میں بولی ۔ پہلے برادری سے پوچھ لینا خان !

پھر وہ ہنستی ہوئی سبزی مارکیٹ کی طرف چلی گئی ۔

اسے بلوچی کی باتوں میں بے حد مزہ آیا تھا ۔ آج وہ دن بھر ان باتوں کو یاد کر کے سبزی کا بوجھ اُٹھائے گھومنے لگی ۔ یہ پچاس برس کے بعد لوگ کتنے دلچسپ ہو جاتے ہیں ۔ رسک لال ہوں یا احمد یار خاں ان کی ایک ہی رگ ہے ۔ زبان پر پند و نصائح کے دفتر ننگا ہوں میں وہی بے بس لالچی حرص ! وہی پیاری سی مجبور ہوس ۔ بڈھے ہو کر مرد کتنے دلچسپ ہو جاتے ہیں جب پڑھی لکھی نہیں ہوں ۔ لاچی نے سوچا ۔ ورنہ میں ضرور ان پر ایک کتاب لکھتی ۔

"میری گلی کے بڈھے"

شام کو جب لاچی ہسپتال میں گل سے ملنے گئی تو اس نے گل سے اس واقعہ کا کوئی ذکر نہ کیا ۔ اس روز بلوچی بھی اپنے بیٹے کو دیکھنے نہ آیا ۔ اس کے بعد بھی کئی دن تک نہ آیا ۔ پھر ایک روز پتہ چلا کہ بلوچی اپنی بیٹھک بند کر کے پونا چلا گیا ہے ۔ اور اس نے اب وہاں سے اپنا کاروبار شروع کر دیا ہے ۔

نواں باب

ڈیڑھ ماہ کے عرصہ کے بعد جب لاچی گل کو ہسپتال سے لے کے آئی تو خانہ بدوشوں کے خیموں کی قطاروں کے باہر درختوں کی قطار پر پتیاں پھوٹی ہوئی تھیں ۔ اور ان میں نرم نرم اور نوخیز کلیاں جھانک رہی تھیں ۔ دمار دنے ان کلیوں کو بہت غور سے دیکھا ۔

دو دن میں یہ کلیاں شگوفے بن جائیں گی ۔ پھر میری زندگی میں بہار آجائے گی ۔ اب تو ایک رات کی بات ہے یا شاید دو رات کی بات ہے ۔

ان کلیوں کو آگ لگ جائے گی ۔ لاچی اپنے منھ سے شعلے اُگلتے ہوئے بولی ۔ یہ شگوفے کبھی نہ کھلیں گے ۔ اور کھلیں گے تو انگارے بن کر تیرا منھ جھلس دیں گے ۔

دمار دزور سے ہنسا ۔

لاچی وہاں سے بھاگ گئی ۔

ان سُندر سُندر اُٹھتی ہوئی کلیوں کا نوخیر جوبن اسے کھائے جارہا تھا ۔

رات کو وہ دونوں پھر اسی پُرانے پل پر تھے ۔ وہ اور گل ! آج آسمان تاریک تھا ۔ یہی تاریکی اس کے دلوں پر بھی مسلط تھی ۔ رہ رہ کر آسمان پر بجلی کوندتی تھی ۔ لیکن ان کے دل میں کسی طرح کی روشنی نہ تھی ۔

گل نے آہ بھر کے کہا ۔ اب تم کیا کروگی ۔

لاچی سیدھے سپاٹ لہجے میں بولی۔ہم ہار گئے۔ وعدہ وعدہ ہے۔
یہ بے ایمانی اور بداخلاقی کا وعدہ ہے لاچی۔ تم اسے پورا نہیں کروگی۔
خانہ بدوش لڑکی اپنی زبان سے نہیں پھرتی۔ لاچی نے سر جُھکا کے جواب دیا۔آنسو اس کی آنکھوں میں اُمڈے چلے آرہے تھے۔تم میرے ساتھ چلوگی۔ گل نے پُرامید لہجے میں کہا۔تم میرے ساتھ چلوگی لاچی! یہ دُنیا بہت وسیع ہے ہم کسی دوسرے شہر میں پناہ لیں گے۔اپنا چھوٹا سا گھر بنائیں گے۔
گھر۔
لاچی روتے روتے سسکنے لگی۔گل نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔
ہاں یہی تو گھر ہے! لاچی نے ایک بار اپنی آنکھیں بند کرکے اپنے دل سے کہا۔انہیں بانہوں میں تو میرا گھر ہے۔یہیں سکون ہے۔یہیں آرام ہے۔یہیں میرا مستقبل ہے۔یہیں پھول کھلتے ہیں۔یہیں کوئی شب و روز کسی کا انتظار کرتا ہے۔گل گل۔میں مرجاؤں گی مگر اپنے وعدے سے نہیں پھروں گی۔
یکایک لاچی اس کی بانہوں سے نکل گئی اور پُل کی ریلنگ پر جُھک کر رونے لگی۔ ٹپ ٹپ اس کے آنسو نیچے ریل کی فولادی پٹریوں پر گرنے لگے۔ لیکن آنسوؤں نے فولاد کو کب گلایا ہے۔
گل کی خالی بانہیں گرگئیں۔ بے بس اور مجبور ہوکر اس نے پُل کی ریلنگ کو ٹھوکر ماری اور بولا۔یہ بے کار۔بے ہنگم دقیانوسی پُل یہاں کھڑا ہے۔یہ پُل جو کہیں جاتا نہیں۔کسی کو کسی سے ملاتا نہیں یہ ظالم پُل ٹوٹ کیوں نہیں جاتا۔
ٹھوکر کھا کر ریلنگ کی آہنی سلاخیں زور سے جھنجھنا اُٹھیں اور ان کی گونج دیر تک فضا میں قہقہے لگاتی رہی۔جیسے کوئی اُن دونوں پر ہنس رہا ہو۔
یہ پُل ہماری محبت کی طرح ہے جو کہیں نہیں جاتی۔لاچی کے دل کی گہرائیوں سے بے اختیار نکلا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔گل نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔اس نے اسے چُپ نہیں

کرایا۔ اس نے لاچی کو رونے دیا۔ اس کے بازو بے کار تھے ۔ اس کا سارا جسم شل تھا۔ وہ نہ سوچ سکتا تھا۔ چپ چاپ لاچی کے قریب ایک بُت کی طرح کھڑا تھا۔ ہوتے ہوتے لاچی کے آنسو تھم گئے۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ اپنے گیلے رخساروں کو اوڑھنی سے صاف کیا پھر دھیرے سے پلٹ کر سر جھکائے ہوئے اس نے گل سے کہا۔

اب میں جاؤں۔

کہاں۔

جہاں کی میں ہوں۔ جو میرا قبیلہ ہے۔ جو میرے رسم و رواج ہیں۔ جو جب سے دُنیا بنی ہے جب سے چلے آئے ہیں۔

گل نے رُندھے ہوئے گلے سے پُوچھا۔ اب میں کہاں جاؤں یہ تو بتاتی جاؤ۔

لاچی کے گلے سے ایک چیخ نکلی۔ لیکن اس نے اسے حلق ہی میں دبا لیا۔ مار دیا۔ گھونٹ دیا۔ کتنی ہی اچھی چیزوں کا۔ اچھے جذبوں کا۔ اچھی آرزوؤں اور تمناؤں کا قتل کرنا پڑتا ہے۔ جب جا کر ایک وعدہ پورا ہوتا ہے۔ وہ چپ کھڑی رہ گئی۔

آسمان تاریک۔ زمین تاریک۔ پٹریاں سیاہ۔ یارڈ بے حس سنگل کی بتیاں کانچ کی نیلی آنکھوں کی طرح پلک جھپکائے بغیر ان دونوں کی طرف تک رہی تھیں۔

آؤ آخری بار مجھے پیار کر لو!

لاچی نے سسکتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں تھے۔ جب کوئی ان کے قریب آکر کھنکارا۔ گل نے لاچی کو اپنے بازوؤں سے الگ کئے بغیر ذرا مڑ کے دیکھا۔ راموتھا۔

راموتے آہستہ سے کہا۔

اسٹیشن پر تم دونوں کو بلایا ہے۔

پلیٹ فارم پر تھرڈ کلاس کے خالی یارڈ کے باہر پاخانوں کی اوٹ بہت سے لوگ جمع

تھے اتنے سارے لوگ کہاں سے آگئے تھے۔ گُل نے دل ہی دل میں سوال کیا۔ اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔ نہ کوئی گاڑی آتی ہے نہ جاتی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ ڈیوٹی کا اسٹیشن ماسٹر اپنے کمرے میں ایک کرسی سے دوسری کرسی لگائے سو رہا تھا۔ یہ لوگ یہاں آکر کیا کر رہے ہیں۔

مگر ان لوگوں میں کوئی مُسافر نہ تھا۔ سبھی دن رات ریلوے پر کام کرنے والے لوگ تھے۔ قلی اور پارڈ مین۔ مستری اور کانٹے والے۔

گھنٹی بجانے والے۔ پانی پلانے والے۔

رامو نے کہا۔

ان لوگوں نے تمہاری کہانی سنی ہے۔ یہ لوگ تمہاری کچھ مدد کرنا چاہتے ہیں۔

پانی پلانے والے ماتا دین نے اپنے نیفے میں اُڑسے ہوئے دو نوٹ نکالے۔ ایک پانچ روپے کا نوٹ تھا۔ ایک ایک روپے کے دو نوٹ تھے۔ پھر اس نے اپنی جیب میں سے ایک اٹھنی نکالی۔ ساڑھے سات روپے اس نے لاچی کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

ادھیڑ عُمر کے داؤد نے اپنی کھچڑی سی داڑھی کھجائی پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پچیس روپے لاچی کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ روپے دے کر وہ کچھ نہیں بولا۔ سر جُھکا کر آہستہ سے پیچھے ہٹ گیا۔

کالا بُھجنگ لین مستری اپنے سفید سفید دانت نکالے ہوئے آگے بڑھا۔ اس نے چالیس روپے لاچی کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

گھنٹی بجانے والا ڈی سوزا آگے بڑھا۔ اس نے دس روپے نو آنے دیئے۔

ایک مُسنّ قلی جس کے سر پر کُشادہ پگڑی تھی۔ اور جس کی میلی وردی پر اب تک ۳۰۹ کا پیتل کا بلا چمک رہا تھا۔ ہوے سے آگے بڑھا اور بولا۔ ہم قُلیوں نے چندہ کر کے ایک سو پینتیس ۱۳۵ روپے جمع کئے ہیں۔ اور سارے روپے اس بُڈھے قُلی نے لاچی کی اوڑھنی میں ڈال دیئے۔ دو چار، پانچ کر کے دوسرے لوگ بھی آگئے۔ لاچی کی اوڑھنی روپوں اور سکّوں سے بھاری ہوگئی۔ اور وہ فرطِ احسان سے

جھلکی گئی۔

پھر یکایک سب اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔
کوئی کچھ نہ بولا۔

رامو نے آگے بڑھ کے کہا۔ ہم لوگ غریب ہیں۔ ہمارے جیتے جی تیری کوئی عزت نہ لے گا۔
جا اپنے سردار کو یہ روپیہ واپس کر دے۔

لاچی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ یکایک اس کی آنکھیں فرطِ مسرت سے روشن ہو گئیں۔ اس نے لپک کر رامو کا ہاتھ چوم لیا۔ اور داؤد کا بڈھے قلی کا وہ خوشی سے ناچنے لگی۔ اور سب کو دُعائیں دینے لگی۔ کیسے مُسکراتے ہوئے چہرے تھے کیسی روشن نگاہیں تھیں۔ گُل حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ان میں سے کوئی فرشتہ نہ تھا۔ سبھی انسان تھے خطاؤں کے پُتلے۔ خامیوں سے بھرپور۔ لیکن یہ کیسا نور تھا جو اس وقت ان کے بدن کے ذرّے ذرّے سے پھوٹ رہا تھا۔ کون کہتا ہے آسمان تاریک ہے۔ کون کہتا ہے زمین بنجر ہے کون کہتا ہے یہ پڑی کہیں نہیں جاتی۔ یہ سنگل یوں ہی چمکتے ہیں۔ ہواؤں میں یہ کیسی خوشبو ہے۔ کانوں میں یہ کیسی راگنی ہے۔ کلیو! مُسکراؤ۔ شگوفو کھل جاؤ۔ بہارو آ جاؤ۔ آج انسان نے اپنا قرض چکا دیا ہے۔

بوڑھے قُلی نے اپنی بھنوؤں کے نیچے سے ایک آنسو پونچھا آگے بڑھ کے اس نے لاچی کا ہاتھ گُل کے ہاتھ میں دیا اور بولا اسے گھر تک چھوڑ آؤ۔

گُل اور لاچی ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

گُل نے ایک گہری سانس لی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا۔ خُدا کرے کل بہار آ جائے۔

گُل سے رخصت ہونے کے بعد لاچی پہلے تو سیدھی اپنے خیمے کو چلی پھر کچھ سوچ کر تیزی سے پلٹی اور دمارو کے خیمے تک پہنچی۔ وہاں پہنچ کر دمارو کو زور زور سے آواز دینے لگی۔

دمارو۔

دمارو۔

لیکن دمارو نہ بولا۔

لاچی نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔

خیمے میں دمارو نہ تھا۔صرف جاماں سو رہی تھی۔لاچی نے پیر کی ٹھوکر مار کر جاماں کو جگا دیا۔

جاماں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھی۔اور لاچی کو دیکھ کر حیرت سے بولی۔

کیا ہے۔اس وقت۔تم یہاں۔

دمارو کہاں ہے۔لاچی نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

شام سے غائب ہے۔جاماں آنکھیں ملتے ہوئے بولی۔کیا کام ہے۔

کہاں گیا ہے۔لاچی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے پھر پُوچھا۔

پلاسٹک کے کارخانے والے سیٹھ نے بلوایا تھا۔شام ہی سے چلا گیا تھا ابھی تک نہیں آیا۔

گنگناتے ہوئے لاچی وہاں سے پلٹی۔پلٹ کر ٹیلے کے پیچھے چلی گئی۔جہاں ٹیلے کے تاریک سائے میں گُل کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

روپے دے آئی۔گُل نے بہت بے چینی سے پوچھا۔

لاچی نے اسے بھری ہوئی اوڑھنی دکھا کر کہا۔

کم بخت ملا ہی نہیں۔اب صُبح ہی دوں گی۔

اب تم مجھے کب ملو گی۔

صُبح قرضہ چکاتے ہی تمہارے پاس آجاؤں گی۔اُسی پُرانے پُل پر تُم میرا انتظار کرنا۔

بہت اچھا۔

گُل اطمینان سے رخصت ہوا۔لاچی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اپنے خیمے میں داخل ہوئی۔ مامن نے ہلکی سی کروٹ لی لیکن پھر مدہوش ہو کر سو گیا۔لاچی خیمے کے اندر پہنچی۔اِدھر اُدھر غور سے دیکھ کر اس نے مٹی کے کوزے میں سارے سکے۔نقدی اور نوٹ ڈال دیئے اور خیمے کے اندر زمین کھود کر اس نے مٹی برابر کر دی۔اور پھر اس کے اُوپر اپنی چٹائی بچھا کر اطمینان سے سو گئی۔بہت عرصہ بعد

اسے بچوں ایسی گہری نیند آئی۔

صبح اس کی ماں نے کچی نیند سے جگا دیا۔ ورنہ وہ جانے کب تک سوتی رہتی۔ اُٹھ کمبخت لکڑیاں چُن کے لا۔ آج کھانا نہیں پکائے گی کیا۔ سورج سر پہ آگیا۔ لاچی ہڑبڑا کے اُٹھی۔ اور رفع حاجت کے لیے باہر چلی گئی۔ پھر اس نے جلدی جلدی ریلوے کے یارڈ میں پڑے ہوئے گھاس کے گٹھوں سے گھاس ادھر اُدھر سے کچھ لکڑیاں۔ کچھ گرے ہوئے اُپلوں کے ٹکڑے جمع کیے اور واپس آکر اپنی، اور ماں کے لیے چائے تیار کی۔ اتنے میں خیموں کے مرکز کی کھلی جگہ میں خانہ بدوش اکٹھے ہوئے اور دف بجانے لگے اور خوشی سے سب گیت گانے لگے۔

لاچی اپنا کوزہ چھوڑ کر بھاگی۔

آسمان صاف تھا۔ درختوں کی شاخوں پر لال لال شگوفے کھلے تھے۔ جیسے سینکڑوں آفتاب ٹہنیوں پر اُتر آئے ہوں۔ بہار کا یہ کیسا سرمدی اعجاز ہے؟ لاچی خوشی اور مسرت سے ان شگوفوں کو دیکھنے لگی۔ آج اس کا بیاہ ہوگا۔ آج وہ گل کے گھر جائے گی خوشی سے وہ ناچنے لگی۔ اور خانہ بدوشوں کے بیچ میں جا کھڑی ہوئی۔

یکایک دمارد کا سیاہ اور کھردرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر پڑا اور وہ ناچتے ناچتے رُک گئی۔

آج جشن بہاراں ہے۔ دمارد خوشی سے بولا۔

ہاں آج جشن بہاراں ہے۔ لاچی بہت مسرت سے بولی۔

آج تمھارا بیاہ ہوگا۔ دمارد پھر خوشی سے چیخ کر بولا۔

ہاں آج میرا بیاہ ہوگا۔

لاچی بہت اطمینان میں بولی۔

مجھ سے! دمارد نے کہا۔ تجھ سے نہیں اپنے گل سے!

دمارد چیخ کر بولا! اپنے وعدے سے مکرتی ہے حرامزادی خانہ بدوش لڑکی کبھی اپنے وعدے سے نہیں مکرتی۔

تو نکال میرا روپیہ ۔ لوگو پنچایت کرو ۔ پنچایت بیٹھے ! ابھی پنچایت بیٹھنے میں اپنا جھگڑا پیش کرتا ہوں ۔

سب لوگ زمین پر بیٹھ گئے ۔

سردار دمار دنے کہا ۔

اس لڑکی کو اس کے باپ نے ساڑھے تین سو روپے میں میرے ہاتھ ہار گیا۔ میں نے اسے اپنے خیمے میں لانا چاہا ۔ کوئی بے انصافی کی ؟

نہیں ۔ سب لوگ سر ہلا کے بولے ۔

یہ نہیں آئی ۔ بولی میں تیرے پاس نہیں جاؤں گی ۔ میں نے اپنا روپیہ اس کے باپ سے مانگا ۔ اس نے نہیں دیا ۔ اس کی ماں سے مانگا اس نے نہیں دیا ۔ بولو کوئی بے انصافی کی ؟

نہیں ۔ خانہ بدوش زور سے چیخے ۔

تب اس لڑکی نے مجھ سے کہا ۔ میں بہار کے دن تک تیرا روپیہ لوٹا دوں گی ۔ آج بہار کا دن ہے اس نے آج تک صرف اسی روپے لوٹائے ہیں ۔ ساڑھے تین سو میں سے صرف اسی آج میں اس سے کہتا ہوں تو میری ہو جا ۔ بولو ۔ کوئی بے انصافی کی ہرگز نہیں ۔

پھر سب خانہ بدوش ایک آواز میں زور سے بول اُٹھے دمار د چپ ہو گیا ۔ اور فتحمند نگاہوں سے لاچی کی طرف دیکھنے لگا ۔

لاچی نے مضبوط آواز میں کہا ۔ میں اس کا روپیہ لے آتی ہوں ۔ رات کو یہ اپنے خیمے میں نہیں تھا ۔ اپنی ہونے والی بیوی کا پلاسٹک کے مل کے مالک سے سودا کرنے گیا تھا ۔

یہ جھوٹ ہے ۔ یہ جھوٹ ہے ۔ دمار د زور سے چیخا ۔ لاچی زور سے بولی ۔ چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ۔ میں ابھی سب پنچوں کے سامنے تیرا روپیہ لوٹائے دیتی ہوں ۔

اتنا کہہ کر لاچی تیزی سے مڑی ۔ اور اپنے خیمے کے اندر چلی گئی ۔ اندر جس چٹائی پر وہ سوئی تھی وہ اسی طرح بچھی تھی ۔ لاچی نے جلدی سے چٹائی کو وہاں سے ہٹا کر پھینک دیا ۔ اور پھر زمین

کھودنے لگی۔ بھُربھُری مٹی اُوپر آتی گئی۔

تھوڑی دیر میں گڑھا نمودار ہوگیا۔ لیکن اس گڑھے میں کچھ نہ تھا۔ جہاں اس نے مٹی کا کوزہ رکھا تھا۔ وہاں اب کچھ نہ تھا۔ نہ کوزہ۔ نہ نوٹ۔ وہاں کچھ نہ تھا۔

لاچی لپک کر باہر آئی۔

باہر آتے ہی اس نے چیخ کر کہا۔ کس نے میرا روپیہ لیا ہے۔

سب لوگ چُپ تھے۔

خانہ بدوشوں کا گروہ حیرت سے لاچی کو دیکھ رہا تھا۔

لاچی نے پلٹ کر اپنی ماں کا گریبان پکڑا۔

بول ماں میرا روپیہ کہاں ہے۔ ماں نے بڑی مضبوطی سے جواب دیا۔ میں نے نہیں لیا۔

ماں کی نگاہوں میں سچ تھا۔ لاچی وہاں سے پلٹ گئی۔ اس نے اپنے چچا مامن کو پکڑا چیخ کر بولی۔ میرا روپیہ واپس دے دے بدمعاش۔

مامن زور سے ہنسنے لگا بولا۔

یہ جھوٹ ہے اب بہانے کرتی ہے۔

جھوٹی۔ مکّار۔ فریبی۔ سارے خانہ بدوش چیخ پڑے آج اسے دمارد کی دلہن بننا پڑے گا۔

آؤ آؤ۔ جاماں۔ روشنی شُنیاں آؤ۔ اسے دُلہن بناؤ۔

گُل پُرانے پُل پر کھڑا تھا۔ اور حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ خانہ بدوش اپنے خیموں کے باہر ناچ رہے ہیں۔ گا رہے ہیں اور زور زور سے دف بجا رہے ہیں۔ اور لاچی ان کے بیچ میں دُلہن بنی کھڑی ہے۔ اور عورتیں بار بار اسے کچھ کہہ رہی ہیں۔

گُل تیزی سے پُل سے اُتر کر خیموں میں چلا گیا۔

اس وقت لاچی کی ماں چاندی کی منھی والا خنجر خیمے سے نکال لائی تھی۔ اور لاچی کی طرف بڑھا

سے کہہ رہی تھی۔

اب تو ختم ہوگیا۔ سب جھگڑا ختم ہوگیا۔ تو ہار گئی ہے اب تجھے دُلہن کا ناچ ناچنا پڑے گا۔

یکایک گل لاچی کے سامنے چلا گیا۔

اسے دیکھ کر سارے خانہ بدوش ذرا ذرا سا پیچھے ہٹ گئے۔ اور میڑھی نظروں سے اُسے دیکھنے لگے۔ مگر سب خاموش تھے۔ نہ دف بجتی تھی نہ کوئی راگ سُنائی دیتا تھا۔ جیسے زمین نے سانس روک لی ہو۔

لاچی!

لاچی نے گل کو ایک نظر سے دیکھا۔ پھر سر جھکا لیا۔

لاچی چل میرے ساتھ میں تجھے لینے آیا ہوں۔ گل نے بڑی بے خوف آواز میں کہا۔ لاچی وہیں کھڑی رہی۔

گل نے حیرت سے پُوچھا۔

لاچی تو نے دُلہن کا لباس پہنا ہے۔

ہاں!

تجھے کل کا وعدہ یاد نہیں ہے۔

یاد ہے میں نے کہا تھا کل میں دُلہن بنوں گی۔

مگر تُو تو میرے ساتھ چل کے دُلہن بننے والی تھی۔

لاچی جھک سی گئی۔ جیسے اس پر منوں بوجھ لاد دیا گیا ہو۔

وہ آہستہ سے بولی۔

کل وہ روپے چوری ہو گئے۔ میں اپنا قرضہ نہیں چُکا سکی۔ چوری ہو گئے؟ گل نے بے اختیار چیخ کر پُوچھا۔ چوری ہو گئے۔

نہیں نہیں تو جھوٹی ہے۔ تو مجھ سے مذاق کرتی ہے۔

لاچی سر جھکائے گُل کے سامنے کھڑی رہی۔

گُل کو بے حد غصّہ آیا اس کا سارا جسم سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔

میں جانتا ہوں تو جھوٹ بولتی ہے۔ تو نے وہ روپے دمارد کو دے دیئے ہیں۔ اور اب تو اس سے شادی کرنے جا رہی ہے۔ میرا باپ سچ کہتا تھا۔ یہ آوارہ اور مکار ہوتی ہیں۔ یہ شریف آدمیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر انہیں تباہ کروا دیتی ہیں۔

لاچی نے آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھوں سے صرف ایک بار گُل کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے سر جھکا لیا۔ گُل اس کے زور سے تھپڑ مارنے کو تھا۔ پھر اس نے بہت مشکل سے اپنے آپ کو روک لیا۔ دیر تک وہ لاچی کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ آہستہ سے گھوما۔ آہستہ سے چلا۔ آہستہ سے چلتا گیا۔ اب وہ آہستہ آہستہ سر جھکائے ٹیلے کی اوٹ میں جا رہا تھا۔

لاچی نے آہستہ سے کہا۔

وہ خنجر مجھے دے دو ماں۔ میں اب دلہن کا ناچ ناچوں گی۔ دف بجنے لگے۔ گھنگھرو کھنکنے لگے۔ جسم مچلنے لگے۔ اور چہرے تمکنے لگے۔

گیتوں کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ پاؤں تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ ہاتھ ناگوں کی طرح جنبش میں آتے گئے۔ لے تیز ہوتی گئی۔ ناچ کی دھمک ہر لحظہ بڑھتی گئی۔ خانہ بدوش ناچتے ناچتے خوشی سے وحشیانہ طور پر چیخنے لگے۔ رقص کے ہر موڑ پر لاچی دمارد کے قریب آتی۔ اور رسم کے مطابق اپنے خنجر کو جھکا کر دمارد کے پاؤں سے چھو کر واپس چلی جاتی۔ ایسی پھرتی سے۔ اس تیزی سے۔ اس انہماک سے اس فنکاری سے وہ آج تک کبھی نہ ناچی تھی۔ ناچتے ناچتے وہ جیسے اپنے وطن کو۔ اپنے قبیلے کو۔ اپنی روایت کو لوٹ آئی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ اس نے کبھی کچھ اور بھی سوچا تھا۔ وہ بھول گئی اس نے کوئی اور سپنا بھی دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں وہ سرکش نگاہ تھی جو ہر خانہ بدوش لڑکی کی آنکھوں میں ہوتی ہے اس کا ناچ اسی طرح طوفانی اور وحشی تھا۔ سمندر کی لہروں کی طرح تھپیڑے مارتا ہوا کسی زہریلی ناگن کی طرح پیچ و تاب کھاتا ہوا۔ ہر تہذیب سے بغاوت کرتا ہوا۔ ہر ٹھہراؤ سے ٹکراتا ہوا اپنے

رقص میں خوش اپنے آپ میں غلطاں ناچ رہی تھی۔ اور خانہ بدوش زمین کی سنہری گرد اُڑاتے ہوئے اپنے قبیلے کی بیٹی کے گرد رقصاں تھے۔ اور دور اوپر درختوں کے سبز پتوں کے جھوم میں سُرخ شگوفے ہنس رہے تھے۔

یکایک ناچ کا آخری چکر لیتے ہوئے لاچی دمارد کے سامنے آئی۔ اور رسم کے مطابق اس نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کئے۔ تاکہ دمارد اسے اپنی آغوش میں لے لے۔ دمارد نے آگے بڑھ کے ناچتی ہوئی۔ لچکتی ہوئی لاچی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اسی لمحے لاچی نے اپنا خنجر اس کے سینے میں اُتار دیا۔

گُل گلی میں کھڑا تھا۔

سامنے دروازے پر داؤد کی بیوی کھڑی تھی۔

گُل چقماق کی چرخی پر ایک چھری تیز کر رہا تھا۔ اور بار بار گھومتی ہوئی چرخی کو اپنے پاؤں کی ضرب سے تیز کرتا جا رہا تھا۔ چھری کی دھار چقماق سے ٹکراتے ہوئے ایک تیز خراش دار آواز پیدا کر رہی تھی۔ کبھی کبھی چقماق اور لوہے کی ٹکر سے ایک شعلہ سا بلند ہوتا اور پھر بجھ جاتا۔

چرخی پھر چلنے لگی۔

داؤد کی بیوی نے گُل سے پوچھا۔

لاچی کو سزا ہو گئی۔

گُل چرخی پر جھک گیا۔ جیسے غور سے وہ چرخی میں کسی خامی کو دیکھ رہا ہو۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

ہاں اسے عدالت نے تین سال کی سزا دی ہے۔

داؤد کی بیوی نے اسے ہمدردی کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اب تم کیا کرو گے۔

گُل نے اسی طرح چرخی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں اس کا انتظار کروں گا۔

یہ کہہ کر وہ پھر چرخی چلانے میں اور چھری تیز کرنے میں مصروف ہو گیا۔ یکایک اس نے چھری کی دھار پلٹی اور دوسری طرف تیز کرنے لگا۔

ارے ارے یہ کیا کرتے ہو۔ داؤد کی بیوی حیرت سے بولی۔ پہلے تم چھری کو صرف ایک طرف سے تیز کیا کرتے تھے۔

گل نے آہستہ سے کہا۔

اماں۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ یہاں چھری کی دھار کو اب دونوں طرف سے تیز کرنا پڑیگا۔

دسواں باب

حاجی عبدالسلام اور میر چندانی دونوں دوست تھے۔ دونوں نے مل کر شہر میں ایک بنک کھولا تھا۔ دونوں نے مل کر اس بنک کے ذریعے لوگوں کو خوب لوٹا تھا۔ دونوں پکڑے گئے اور اب جیل میں سزا بھگت رہے تھے۔ لیکن انھوں نے اس ہوشیاری سے کام لیا تھا کہ روپیہ پولیس ان سے نہ اگلوا سکی تھی۔ ستّر لاکھ کا غبن تھا۔ اتنا روپیہ کوئی آسانی سے کیسے دے سکتا ہے۔ چاہے برسوں کی جیل کیوں نہ ہو جائے۔ اس لئے دونوں بڑے مزے سے جیل میں رہتے تھے اور روپے کے زور سے جو چاہتے کرتے۔ اسسٹنٹ جیلر ان کا دوست بن گیا تھا۔ وارڈرن ان کی مٹھی میں تھے اس لئے دونوں دوست جیل میں بھی اسی شان سے رہتے تھے۔ جیسے وہ جیل میں نہ ہوں۔ مائیکل روڈ کے کسی اچھے فلیٹ میں رہتے ہوں۔ اُن کا کھانا اچھے ہوٹلوں سے آتا تھا۔ اسٹیٹ ایکسپریس سے کم کا سگریٹ وہ نہ پیتے تھے۔ ریس جانے کو جی چاہتا تو سپرنٹنڈنٹ جیل کی نظر بچا کر ریس بھی چلے جاتے تھے کئی بار وہ دلدار روڈ پر جاکر طوائفوں کا گانا بھی سُن آئے تھے۔ اُن موقعوں پر احتیاطاً دو ہٹے کٹے وارڈرن بھی ان کے ساتھ رہتے ان کا روپیہ اب محفوظ جگہ پر تھا۔ اس لئے جیل سے نکل بھاگنے کا خیال بھی ان کے دل میں نہ آتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہی سوچ کر اسسٹنٹ جیلر بھی انہیں ڈھیل دیتا ہو۔ اسسٹنٹ جیلر پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اپنے زمانے میں ایک کالج میں معاشیات کا لیکچرار تھا۔ تنخواہ ساڑھے تین سو روپے تھی۔ کنبہ بڑا تھا۔ اس لئے ہمیشہ تنگدست اور چڑچڑا رہتا تھا

کلاس میں لڑکوں سے ایسا سلوک کرتا جیسے وہ تھانیدار ہو۔ پروفیسر نہ ہو۔ لڑکے اس سے ہمیشہ نالاں رہتے۔ دو تین بار کالج میں اس کے خلاف اسٹرائک بھی ہوئی۔ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ گورنمنٹ کالج کا وہ لیکچرار تھا۔ انگریز پرنسپل تھا۔ انگریزوں کو اس زمانے میں اسٹرائک کے پیچھے انقلابیوں کا ہاتھ نظر آتا تھا۔ اس کا فائدہ اٹھا کر اسسٹنٹ جیلر کالی چرن نے اپنے پرنسپل کی سفارش سے اپنا تبادلہ کرالیا۔ اور کالج کی لیکچرار شپ کو خیرباد کر کے جیل کے محکمے میں آگیا۔ کیوں کہ صوبے کی جیلوں کا انچارج انگریز اس کے پرنسپل کا دوست تھا۔ یہ محکمہ کالی چرن کو بہت پسند آیا۔ بالکل اس کی طبیعت اور مزاج کے مطابق تھا۔ پھر یہاں انڈا۔ گوشت۔ سبزی۔ دودھ۔ ملازم سب مفت ملتے تھے۔ امیر قیدیوں کو مراعات دے کر وہ ان سے ہر ماہ خاصی رقم اینٹھ لیتا تھا۔ کالج کے لڑکوں سے چند ذلیل قسم کے ٹیوشنوں کے سوا اُسے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔

یہاں وہ بے حد خوش تھا۔ جیسے اپنوں میں آگیا ہو۔

یہ درست ہے کئی بار وہ معطل ہوا۔ کبھی اس کی ترقی ہوئی کبھی تنزل کیا گیا۔ مگر یہ تو زمانے کے اُتار چڑھاؤ ہیں۔ اُونچی لہروں پر سوار ہو کر آدمی کبھی آگے نکل جاتا ہے۔ کبھی وہی لہریں اسے دھکیل کر پیچھے پھینک دیتی ہیں۔ زمانہ ایک سمندر ہے۔ اس میں ہمیں رہنا ہے۔ اس میں ڈوبنا ہے۔ اس کا غم کیا؟ کالی چرن صرف اتنی احتیاط ضرور کرتا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کے سامنے اپنے آپ کو بیحد مستعد اور دیانتدار ثابت کرتا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل بھی ایک پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اگر وہ جیلر نہ ہوتا تو ادیب ہوتا۔ شاعر ہوتا۔ موسیقار ہوتا۔ لیڈر ہوتا۔ یعنی وہ ایسا کچھ ضرور ہوتا جہاں اسے اپنی بات کہنے اور سننے اور منوانے کے ذرائع میسر آتے۔ اس کا دل ایک عجیب و غریب نرمی اور مہربانی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ انسان کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا اس کے ذہن میں ایک عجیب و غریب تصورات کے پہلے تھے۔ وہ خدمت کرنا چاہتا تھا اور نیک بننا چاہتا تھا۔ بچپن ہی سے اسے مصوری کا بہت شوق تھا۔ لیکن اس کے والد رائے بہادر شری گنگا سہائے ڈپٹی انسپکٹر جیل خانہ جات تھے۔

اور یہ محکمہ ایک طرح سے ان کا اپنا ہی تھا۔ اور زمانہ انگریزوں کا تھا۔ اور رائے بہادر کا شمار

سرکار انگلیشیہ کے فرزندانِ خاص میں ہوتا تھا۔ اس لئے انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے بیٹے خوب چند کو جیل میں بھرتی کرا دیا جائے۔ گو خوب چند کا ارادہ پیرس میں مصوری سیکھنے کا تھا۔ لیکن رائے بہادر کے سامنے اس کی ایک نہ چلی اور وہ جیل کے محکمے میں بھرتی ہو گیا۔ اگر وہ ضدی اور خودسر ہوتا تو بھوکا رہ کر مصوری کو جاری رکھ سکتا تھا۔ لیکن وہ بے حد شریف آدمی تھا۔ اس لئے وان گوگ تو نہ بن سکا۔ جیلر بن گیا۔ لیکن اس کی طبیعت کی نیکی اور دل کی شاعری اور تصورات کی مصوری یہاں بھی اثر دکھائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ قیدیوں سے بہت نرمی اور ملائمت سے پیش آتا تھا۔ اپنے عملے کو اس نے بہت ڈھیل دے رکھی تھی۔ انسانوں پہ بھروسہ کرنا اس کے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔ مصوری کا شغل اب بھی جاری تھا۔ لیکن وہ جدید مصوری سے بہت بیزار تھا جس میں عورتیں سرکنڈوں کی طرح بدصورت اور دُبلی پتلی ہوتی جاتی ہیں۔ اور مرد مُرغ کی طرح موٹے۔ اسے لوک مصوری بھی پسند نہ تھی جس میں دیہاتیوں کا سا اجڈپن پایا جاتا تھا۔ اسے پُرانے بنگال اسکول کی مصوری بہت پسند تھی۔

دھیمی دھیمی سُست اور سوئی ہوئی مصوری۔ اونگھتا ہوا سا ماحول۔ فطرت غنودگی کے نشے میں سرشار۔ بانس کے جھنڈوں میں نیم مستور گاؤں اور ندی کے کنارے خیالات میں کھوئی حسینہ۔ ایسی پیاری۔ ایسی نازک ایسی کٹیلی آنکھوں والی کہ اگر پلٹ کر کہیں ایک نگاہ بھی ڈال دے تو آدمی وہیں خاک ہو جائے جانے کس دیس میں یہ عورتیں رہتی ہیں؟ کیا کھاتی ہیں؟ کھاتی بھی ہیں کہ صرف اپنے حُسن کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہیں۔ اور واقعی ایسی مکمل عورت کو کھانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔؟ ہاتھ پاؤں ہلانے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو ایک تصویر ہے جسے آدمی سونے کے فریم میں جڑوا کر دیکھا کرے۔ اور بہت سے آدمی ایسا سوچتے ہیں۔ اس لئے بہت سی عورتیں ایسے ہی سونے ایک فریم کی خواہش کیا کرتی ہیں۔ خوب چند کے پاس سونے کا فریم تو تھا۔ لیکن وہ مکمل عورت اسے آج تک نہ مل سکی تھی۔ اس لئے عُمر کے پچاس برس گزرنے کے بعد بھی وہ کنوارا تھا۔ اس لئے اس کے دل میں امّید کی وہ لو بھی کم ہو گئی تھی شاید اسے وہ مکمل عورت کبھی نہ مل سکے گی

اور جوں جوں اس کے دل میں یہ نااُمیدی گھر کرتی وہ اپنی تصویروں کی عورت کے نقوش نازک سے نازک تر سانچوں میں ڈھالتا جاتا۔ کبھی کبھی ان تصویروں کو دیکھ کر رو دیتا۔ کیا ان میں کوئی تصویر زندہ نہیں ہوسکتی۔ کیا یہ ہونٹ بول نہیں سکتے۔ کیا ان باہنوں کا مرمریں باہنوں میں نہیں آسکتا۔ یہ صف آرا پلکیں اگر رُخساروں پر گر جائیں تو کیا ہو۔ تو کیا ہو۔ کوئی نچلا اسے یہ بتانے کو تیار نہ تھا کہ اس معجزے کے بعد محبت ہوگی۔ محبت کے بعد ممکن ہے شادی ہو۔ شادی کے بعد ممکن ہے بچے ہوں۔ بچوں کے بعد ممکن ہے جھگڑے ہوں۔ بچوں اور جھگڑوں کے بعد طویل سالہا سال ساتھ رہنے کے بعد وہ عورت سرکنڈے کی طرح دُبلی پتلی کمّس کی طرح موٹی ہو جائے۔ اور اس کا خواب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پارہ پارہ ہوجائے۔ شاید اسی لئے اس نے ابھی تک شادی نہ کی تھی۔ وہ صرف پانی پر تیرتے ہوئے کنول دیکھنا چاہتا تھا۔ نہ اس کیچڑ کو جہاں کنول پیدا ہوتا ہے۔ نہ کہ اس انجام کو جہاں ہر کنول کی پتی پتی مُرجھا جاتی ہے خوب چند ایک خالص روحانیت پسند انسان تھے۔ اور اپنے تصوّرات کے جیل خانے میں بند رہتا تھا۔ اس کی طرح بہت سے انسان ہمیشہ کسی نہ کسی جیل خانہ میں بند رہتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو آزاد تصور کرتے ہیں۔

جب لاچی پہلی بار سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں لائی گئی تو خوب چند اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یکایک اسے محسوس ہوا جیسے اب تک جو تصویر اس کے دل کے نہاں خانے میں چھپی ہوئی تھی آج زندہ ہوکر اس کے سامنے جلوہ گر ہے۔ وہی فسردہ۔ سوگوار سا حُسن۔ آنکھوں میں وہی کٹیلا پن۔ چال کا وہی انداز۔ گردو پیش سے بے پروا۔ اور بے نیاز لاچی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ چند لمحوں تک وہ اسے مبہوت اور پریشان دیکھتا رہا۔ اس کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر اُسے احساس ہوا کہ وہ کمرے میں اکیلا نہیں ہے۔ اس کا اسٹینو گرافر تھا۔ دو اور کلرک تھے وارڈرز تھے اچھا خاصا عملہ تھا خوب چند نے لاچی کے چہرے سے نظریں ہٹا کر لاچی کے کاغذات پر ڈالیں۔ یہاں پر اسے ایک اور دھچکا لگا۔

تم نے قتل کیا ہے۔ ؟ خوب چند نے بے اختیار ہوکر حیرت سے لاچی کی طرف

دیکھ کر کہا۔

ورنہ یہاں کیوں آتی جی۔ لاچی نے پُوچھا۔

سیدھے سیدھے بات کرو۔ ایک وارڈرن بولا۔ یہ سپرنٹنڈنٹ جیل ہیں۔

اچھا۔ لاچی نے ہاتھ کے اشارے سے انتہائی بے پروائی سے خوب چند کو سلام کیا۔ جیسے اپنے ماتھے سے کوئی مکھی ہٹا رہی ہو۔

نہیں نہیں بات کرنے دو۔ خوب چند نرمی سے بولا۔ اور کی نگاہیں کاغذات پر جھک گئیں۔ وہ دیر تک کاغذات کو اُلٹ پُلٹ کر دیکھتا رہا۔ چند لمحوں تک وہ لاچی کے چہرے کی طرف نہ دیکھ سکا۔ جس کے چہرے پر اب استہزا کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔

یہ تصویر بولتی بھی ہے۔ خوب چند نے سوچا۔ متحرک بھی ہے لیکن سینما کی طرح نہیں زندگی کی طرح۔ پھر بھی اُسے شدید دھچکا لگا۔ کیوں لگا۔ کیا اس لئے جس طرح وہ تصویر کو بولتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح یہ تصویر نہیں بول رہی تھی۔ اس کی تصویر تو شاید اس سے ٹیگور کے نغموں میں خطاب کرتی۔ عمر خیام کی رُباعیاں سُناتی یا کیٹس کی بسمیا کی طرح کسی انجانے جزیرے کو مدھم مدھم سروں کے میٹھے سنگیت سے لبریز کر دیتی۔ لیکن یہ کیسا کھرا سپاٹ لہجہ تھا اس تصویر کا! خوب چند کو شدید ذہنی کوفت ہوئی۔ اس نے ذرا کڑے لہجے میں پُوچھا۔

کوئی کام جانتی ہو۔ باسکٹ بُن سکتی ہوں اور چٹائیاں اور ..... وہ رُک گئی۔

اور ..... خوب چند نے پُوچھا۔

اور نٹوں کے سب کرتب جانتی ہوں۔ ایک موٹے رسّے پر چل سکتی ہوں۔ چلتے ہوئے گولے میں گزر سکتی ہوں۔ ایک سانس میں دس قلابازیاں لگا سکتی ہوں۔

کدھر گئی وہ تصویر وہ بانسوں کے سرسراتے ہوئے جھنڈ۔ ہوا رومان کی خوشبو سے مہکی ہوئی۔ اور ندی کے کنارے گردن جھکائے اداس مغموم حسینہ۔ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی۔ ارے یہ بالکل تصویر ہے۔ لیکن کتنی مختلف۔ خوب چند اندر ہی اندر بلبلا اُٹھا۔ پچاس برس

سے وہ جس تصویر کو دیکھتا آیا تھا آج وہ ایک لمحے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کے قدموں میں پڑی تھی۔

لاچی کی آواز آ رہی تھی۔ اور پنجہ بھی لڑا سکتی ہوں لاچی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا۔ لڑاؤ گے۔

کمرے میں جتنے لوگ تھے سب ہنس پڑے۔ مگر دلدار خاں پنجابی وارڈرن کو بے حد غصّہ آیا۔ اور یونہی سپرنٹنڈنٹ جیل کی عزت رکھنے کے لئے یہ موقعہ اچھا تھا۔ اس نے فوراً کہا۔

صاحب کی بات جانے دو پہلے ہم سے پنجہ لڑاؤ۔

دلدار خاں پنجابی نے اپنا موٹا کھردرا ہاتھ لاچی کی طرف بڑھایا لاچی سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ بولی۔

تمہارا ہاتھ مجھ سے کڑا معلوم ہوتا ہے۔

کمرے میں سب لوگ ہنسنے لگے۔

دلدار خاں نے جھک کر طنزاً کہا۔

بس ڈر گئیں۔

لاچی کا مُنھ لال ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دلدار خاں کی ہتھیلی پر جھپٹا مارا۔ اور اپنی انگلیاں اس کی انگلیوں میں پھنسا دیں۔ دلدار خاں نے ہاتھ سے ہاتھ ملا کر زور لگایا۔ لاچی سر سے پاؤں تک لچک گئی۔ لیکن اس کا بازو خمیدہ نہ ہوا۔

حرامزادی! منّی۔

دلدار خاں جھلا کر بولا۔ اور اس نے پھر پورا زور لگایا۔ حرامزادہ تو۔ تیرا باپ! پنجہ لڑا۔ باتیں نہ کر۔

لاچی غصّے میں بولی۔

دلدار خاں کا پورا زور لاچی کے ہاتھ پر لگ رہا تھا۔ لیکن لاچی نے منّی کے گُر یونہی نہیں

سیکھے تھے ۔ اس نے اپنے بدن کو ڈھیلا کر اس زور کو سارے بدن پر تقسیم کر لیا۔ مگر اس کی بانہہ اسی طرح دلدار خاں کی بانہہ سے خمیدہ ہو کر اُلجھی رہی ۔

دلدار خاں کا چہرہ جو پہلے سانولے رنگ کا تھا۔ اب غصہ سے سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ یکایک لاچی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنسنے لگی۔ اور بولی ۔ دیکھو اب میں اپنا پنجہ چھڑاتی ہوں ۔ اس کے بعد وہ جانے کسی طرح لچکی اور ایک حرکت اس نے کی کہ ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے لاچی کا پنجہ دلدار کے پنجے سے آزاد ہو گیا۔

کمرے میں سب لوگ زور زور سے ہنسنے لگے ۔

دلدار خاں کا ہاتھ لاچی کو مارنے کے لئے ادھر اُٹھا ۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ جیل کے زرد۔ دوشت چہرے کو دیکھ کر وہیں رہ گیا۔

دلدار ! یہ کیا حماقت ہے ۔ خوب چند نے ذرا درشتی سے کہا ۔

پھر عورتوں کی انچارج جیناںبائی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ۔

جیناںبائی اسے لے جاؤ اور چھ ماہ تک اسے دوسری عورتوں سے الگ رکھو ۔ بہت خطرناک عورت معلوم ہوتی ہے ۔ میں الگ نہیں رہوں گی ۔ میں الگ نہیں رہوں گی ۔ یکایک لاچی زور سے چیخی۔ جیناں بائی گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی ۔

خوب چند کے حکم سے دو تین وارڈروں نے مل کر لاچی کو گھیرا اور اسے عورتوں کے سرکل جیل میں پہنچا آئے جو بڑی جیل کے جنوبی کونے میں تھی ۔

رات بھر خوب چند کو نیند نہیں آئی ۔

وہ بہت دیر تک اپنے خوب صورت فلیٹ کی مدھم مدھم روشنیوں میں دیواروں پر آویزاں تصویروں کو دیکھتا رہا ۔ اسے اپنی ان تصویروں سے کیسی محبت تھی جیل کی سخت گیر بوریت اور ظلم و ستم سے بھری ہوئی دُنیا کے بعد یہ تصویریں ہی اس کا سہارا تھیں ۔ یہی تصویریں اس کی بیوی ۔ اس کے بچے اس کے دوست ۔ برسوں کی بیتی ہوئی ریاضت اور اُلفت اس نے ان تصویروں کی ایک

ایک لکیر میں کھلادی تھی۔ لیکن یہ برسوں کی جانی پہچانی تصویریں آج اسے کتنی انجان اور بے تکی نظر آرہی تھیں ۔ جیسے سب کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ سب کچھ گر گیا تھا اور سب کچھ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا ۔

وہ تو ان تصویروں کو جانتا بھی نہ تھا۔ یہ تصویریں وہ کیسے بنا سکتا تھا۔ یہ تصویریں بالکل مصنوعی تھیں ۔ یہ تصویریں اس کی نہ تھیں ۔ یہ کسی احمق نومشق کے بے معنی پیچ و خم تھے ۔ ان میں کیا رکھا ہے۔ برسوں سے وہ ان تصویروں کو بلانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن یہ تصویریں کیسے بولتیں ۔ مُردہ تصور کی مُردہ لاشیں ان میں روح نہ تھی ۔ پھر یہ تصویریں کیسے بولتیں ۔ اُسے لاچی پر بہت غصہ آیا ۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بیکار کاموں میں اُلجھ کر بوڑھا ہوگیا۔ جیسے وہ کسی غلط راستے پر چلتے چلتے ایک اندھے کنویں پر جا پہنچا ہے۔ اس نے ایک ایک کرکے دیواروں سے سب تصویریں اُتاریں ۔ اُنھیں فریم سے الگ کیا ۔ اور آہستہ آہستہ اُنھیں اس طرح پھاڑنے لگا جیسے وہ اپنی زندگی کے پُرانے ورق چاک کر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ۔ کیوں کہ زندگی کے ورق کاغذ کے ورق تو ہوتے نہیں ۔ وہ پھر نہیں لکھے جا سکتے ۔

ٹھیک ہے اب وہ صرف جیلر بنے گا ۔

اس نے دل میں کہا ۔

جیناں بائی جب جوان تھی تو اپنے جسم کا دھندا کرتی تھی ۔ اور جب شباب ڈھلنے لگا تو اس نے جیب کاٹنے کی سائڈ لائن بھی اختیار کرلی ۔ ادھیڑ عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ مشہور کٹنی بن چکی تھی ۔ اور اس کا کام خوب صورت عورتوں اور لڑکیوں کو پھانسنا اور اُنھیں مشہور دلالوں کے ہاتھ فروخت کردینا تھا ۔ اس لئے اسے خاصے پیسے مل جاتے تھے ۔ خطرہ بھی کافی تھا ۔ چار چھ بار اسے جیل بھی ہوئی تھی ۔ آخری بار جب اس نے ایک حاملہ لڑکی کو پھانسا تو اس کے بچے کا گلا گھونٹ دینے کے جرم میں جیناں بائی کو عمر قید کی سزا ہوئی ۔ وہ بڑی رحمدل آنکھوں والی ۔ پوپلے مُنہ والی ۔ میٹھے بول والی بوڑھی عورت تھی ۔ اس کی چال ڈھال سے ہر وقت ایک عجیب سی ماتا پرستی رہتی تھی ۔ جس سے وہ عورتوں کی جیل میں بہت پاپولر ہوگئی تھی ۔ چار چھ بار جیل کاٹ کے اب وہ اس ماحول

سے مانوس ہوگئی تھی۔ اب تو وہی جیل اس کا گھر تھی وہی اس کا دیس تھی وہی اس کی سیاست۔ وہ جیل کی عورتوں میں ممتاز تھی تو جیل کے حکام بھی اسے پسند کرتے تھے مردوں کی جیل کے مشہور غنڈے بھی اس کی عزت کرتے تھے۔

اس لئے کہ وہ سب کام جانتی تھی۔ اور انتہائی رازداری اور دیانت داری اور پوری پوری سچائی سے بے ایمانی کے سارے کام پورے کرتی تھی۔ جیسے ہر بزنس مین کو ہونا چاہئے! افسوس حالات نے یاوری نہیں کی۔ اسے تعلیم نہیں ملی۔ اور وہ ایک غریب عورت تھی۔ ورنہ ایک کامیاب بزنس مین کی تمام خصوصیات اس میں موجود تھیں۔ اگر اسے عمر قید نہ ہوتی تو شاید ایک دن وہ لکھ پتی ہوجاتی جیناں بائی باہر کی دنیا کے پیغام عورتوں کی جیل میں پہنچاتی تھی۔ مردوں کی جیل اور عورتوں کی جیل میں رابطہ بھی اسی کے ذریعے ہوتا تھا۔ چرس اور رقم کی درآمد بھی اسی کے ذریعے ہوتی تھی۔ جیل میں دو تین عورتیں ایسی تھیں کہ کسی طرح مارفیا کے انجکشن کے بغیر زندہ نہ رہ سکتی تھیں۔ یہ کام بھی جیناں بائی کے سپرد تھا۔ اس کے علاوہ آہنی سلاخوں کے ادھر ادھر کیا عشق نہیں ہوسکتا؟ اس جیل کے لوگ کیا عورتوں کو بھول جاتے ہیں۔ کیا وہ مرد نہیں ہوتے۔ کیا ان کے جذبات نہیں ہوتے۔ کیا وہ خشک ماچس کی طرح بھڑک نہیں سکتے۔ زندگی ایک غبارہ ہے جسے اگر ایک طرف دباؤ تو دوسری طرف سے ابھر آتا ہے۔ بہت زیادہ دباؤ تو پھٹ جاتا ہے۔ اور یہ بھی ایک طرح سے بوجھ کے خلاف احتجاج ہی ہے۔ جسے سمجھنے کے لئے کسی غیر معمولی بصیرت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جیناں کبھی قیدیوں پر غیر معمولی اور زیادہ دباؤ نہیں ڈالتی تھی۔ بس اتنا ہی جتنا وہ برداشت کرلیں۔ کیوں کہ جو سمجھدار مجرم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے پیشے میں شریف پیشہ انسانوں کی طرح دباؤ ڈالتے ہیں۔ بس اتنا بلیک میل کرو جتنا دوسرا برداشت کرسکے۔ بس اتنی رشوت لو جتنی دوسرا دے سکے۔ بس اتنی بے عزتی کرو جتنی دوسرا گوارا کرسکے۔ بس اتنی چوری کرو جس سے دوسرا زندہ رہ سکے۔ تاکہ اس کے گھر میں پھر چوری کی جاسکے۔ جرم اور سیاست میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔

پہلے چھ ماہ بہت آرام سے کٹے۔ گل بھی برابر ملنے آتا تھا۔ کھانا بھیک مانگے بغیر

چوری کئے بغیر کسی سے بے عزت ہوئے بغیر ملتا تھا مشقت بھی معمولی تھی۔ دوسری عورتوں کے لئے تکلیف دہ ہوگی۔ لیکن لاچی کے لئے معمولی تھی۔ چھ ماہ کے بعد جو لاچی دوسرے قیدیوں سے الگ رہی تو اس کے دل میں ایک سکون۔ ایک طمانیت سی پیدا ہوگئی۔ باہر کی ہنگامہ پرور زندگی کے بعد جیل کی یہ زندگی لاچی کو بے حد پُرسکون اور خوب صورت معلوم ہوئی۔

ایک روز جیناں بائی لاچی کے پاس گئی اور اس سے بولی۔

چل تجھے سپرنٹنڈنٹ جیل نے بلایا ہے۔

کیوں بُلایا ہے۔

مجھے کیا معلوم۔ جیناں نے مُسکرا کر کہا۔ تیرے فائدے کا کوئی کام ہوگا۔

چل ـــــ

لاچی جیناں بائی کے ساتھ ہولی۔ خوب چند نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس وقت سات بج چکے تھے۔ آفس کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ خوب چند نے آفس سے ملحق ایک کوٹھری خالی کروالی تھی۔ اور اسے اپنے لئے دن میں آرام کرنے اور کھانا کھانے کا کمرہ بنالیا تھا۔

یہیں پر مصوری کا سامان بھی گھر سے اُٹھا لایا تھا۔ جب لاچی کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے لکڑی کے ایزل پر ایک کورے سفید کاغذ کو ٹنگے دیکھا تو حیرت سے بولی۔

یہ کیا ہے۔

تمھاری تصویر بناؤں گا۔

خوب چند نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

میری تصویر۔ لاچی حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات و تاثرات کا اظہار کرنے لگی۔

خوب چند نے سرہانے کے ایک کونے میں پڑی گٹھری کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

وہ تمھاری چنری۔ قمیص۔ واسکٹ اور گھاگرا پڑے ہیں۔ یہ جیل کے کپڑے اُتار کے انھیں پہن لو۔ اور جب پہن لو تو مجھے آواز دے دینا۔ میں آفس میں بیٹھتا ہوں۔

بہت اچھا۔
لاچی لپک کر گٹھری کی طرف بڑھی۔
خوب چند اور جیناں باہر آگئے۔
باہر آفس میں آ کے خوب چند نے جیناں سے کہا۔
اب تم جاؤ۔
جیناں نے ایک پُر فریب مُسکراہٹ سے خوب چند کی طرف دیکھا۔ جھک کر سلام کیا اور مُسکراتی ہوئی چلی گئی۔
تھوڑی دیر کے بعد لاچی کی آواز آئی۔
اندر آجاؤ۔
خوب چند اندر گیا۔
لاچی لکڑی کے ایک چھوٹے سے اسٹول پر دف لئے ایک عجیب بانکی ادا سے کھڑی تھی۔ خوب چند کو دیکھتے ہوئے بولی۔
بس ایسی تصویر کھینچ دو۔
ایسی ہی کھینچوں گا۔
خوب چند نے قلم سنبھالا اور رنگوں کی آمیزش شروع کر دی۔
مگر کسی سے کہنا مت میں تمھاری تصویر بنا رہا ہوں۔
اچھا نہیں کہوں گی۔ مگر اس میں کیا بُری بات ہے۔ سبھی لوگ فوٹو لیتے ہیں۔ ایک بار ایک انگریز نے اسٹیشن پہ میرا فوٹو لیا تھا۔ اور مجھے پانچ روپے بھی دیئے تھے۔ بہت لوگ میرا فوٹو لیتے ہیں۔
یہ فوٹو نہیں ہے۔
یہ تصویر ہے۔ اسے بُرش سے۔ اس رنگ سے اس کاغذ پر بناتے ہیں۔

اس میں کتنا ٹائم لگے گا۔

یہ تصویر دس دن میں بھی بن سکتی ہے۔ دس مہینوں میں بھی بن سکتی ہے۔ دس سال بھی لگ سکتے ہیں۔

تو میں کیا دس سال تک تمھاری جیل میں رہوں گی۔

نہیں جب میں تمھارے گھر آکر تمھاری تصویر بنایا کروں گا۔

میرا تو کوئی گھر نہیں ہے۔ لاچی اداس ہو گئی۔ ہوتا اگر گل سے میری شادی ہو جاتی۔

گل وہی پٹھان جو تم سے ملنے آتا ہے۔ خوب چند نے اس سے پوچھا۔

ہاں۔

تم اس سے پیار کرتی ہو۔

زندگی سے زیادہ چاہتی ہوں بابو۔ ایک بات مانو گے۔ لاچی نے یکایک پُر امید ہو کے پوچھا۔

بتاؤ۔

گل کو بھی جیل میں رکھ دو۔ اسے یہیں کہیں ایک کوٹھری دے دو۔ تمھارے اِدھر بہت جگہ ہے ہم دونوں کہیں رہ لیں گے۔ یہیں اپنا گھر بنا لیں گے۔

خوب چند خوب ہنسا۔

بولا۔

پگلی جیل میں مجرم آتے ہیں سزا کاٹنے کے لئے۔ کیا تمھیں باہر کی دُنیا میں اور جیل کی دُنیا میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

لاچی نے بہت سنجیدگی سے سر ہلا دیا۔

باہر کی دُنیا بھی ایک جیل ہے بابو فرق اتنا ہے کہ اس میں لوہے کی سلاخیں نہیں ہوتیں

لاچی خوب چند کی طرف بالکل نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اُوپر خلا میں کہیں دیکھ رہی تھیں

خوب چند اس کے سوچ میں ڈوبے ہوئے حُسن سے مبہوت سے دیکھتا رہا۔

یکایک لاچی مُڑی تو خوب چند بھی گھبرا کے ایزل کی طرف پلٹا۔ لاچی نے ہنس کے کہا۔

ارے بابو تم نے تو ابھی تک تصویر شروع بھی نہیں کی۔ یہ کاغذ تو کورا ہے۔

ابھی میں تمہیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

مجھے سمجھنے کی کوشش۔ مجھ میں کیا ہے۔ میں تو بس لاچی ہوں۔

یہی تو مشکل ہے۔

کیا۔

کچھ نہیں۔ خوب چند ذرا تلخی سے بولا۔ تم اسٹول پر چپکی کھڑی رہو۔ اور اپنی جگہ سے ہلو نہیں۔ اور کوئی بات بھی مت کرو۔

یہ تو بہت مشکل ہے۔

مگر اس کے بغیر تصویر نہیں بن سکتی۔

بہت اچھا اب میں بالکل چپ رہوں گی۔

لاچی نے اپنے مُنھ پر انگلی رکھ دی۔

خوب چند نے پوز دیا۔

اور وہ اسی پوز میں چند منٹ ساکت کھڑی رہی۔

خوب چند ایزل پر تصویر بنانے لگا۔

چند منٹ کے بعد لاچی بولی۔

بابو مجھے پیاس لگی ہے۔

اب خوب چند اس کے لئے پانی لے کر آیا۔

پھر چند منٹ کے بعد لاچی بولی۔

بابو! اگر کل بھی کسی کو مار کے یہاں آجائے تو تم اسے اپنی جیل میں بگر دو گے۔

کس کو مار کے آئے گا۔

کسی کو بھی مار دے گا۔ اس دُنیا میں بہت ظالم ہیں مارنا گُناہ ہے جُرم ہے اور فرض کرو گل کو ڈھائی سال کی سزا نہ ہوئی عُمر قید ہو گئی۔

تو میں بھی زندگی بھر اس کے ساتھ جیل میں رہوں گی۔ فرض کرو اُسے پھانسی ہو گئی۔

باپ رے! تو یہ تو غلط بات ہو گئی۔ لاچی نے ایک دم کہا۔

پھر سوچ سوچ کر بولی۔

اچھا تُم تصویر بناؤ۔ اب میں کچھ نہ کہوں گی۔

وہ پھر پونے کے کھڑی ہو گئی۔

خوب چند نے اسے تہدیدی انداز میں کہا۔ اب ہلنا مت اپنی جگہ سے۔

مشکل سے آدھ گھنٹہ گزرا ہو گا لاچی نے کہا۔

بابو تم جیل کے سب سے بڑے بابو ہو۔

ہاں میں سپرنٹنڈنٹ جیل ہوں۔

سپری ٹان۔

لاچی نے رُکتے رُکتے اس کا عہدہ یاد کرتے ہوئے کہا۔

ہاں سپری ٹان۔ خوب چند ہنسا۔

اور سپری ٹان سے بڑا جیل کا بابو اور کوئی نہیں ہوتا۔

لاچی نے پوچھا۔

ہوتا ہے ڈپٹی انسپکٹر جنرل۔

ڈپٹی جرنیل؟ اس سے بڑا بابو کون ہوتا ہے۔

اس سے بڑا جرنیل ہوتا ہے۔ خوب چند نے ہنس کر کہا۔

اور اس سے بڑا کون ہوتا ہے۔؟

اور اس سے بڑا خدا ہوتا ہے۔ خوب چند نے گویا معاملے کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

لاچی چپ ہوگئی۔ دیر تک چپ رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔ خدا بھی مرد ہے۔ اس سنسار میں جتنے بڑے بڑے بابو ہیں سبھی مرد ہیں۔ پھر مجھے انصاف کہاں سے ملے گا۔

خوب چند چونک گیا۔ وہ پلٹ کر لاچی کی طرف دیکھنے لگا۔ لاچی کے چہرے پر کچھ نہ تھا۔ اسے مطلق کوئی احساس نہ تھا کہ اس نے کیا بات کہہ دی۔ وہ پوز لئے۔ دف اونچا کئے چپ چاپ کھڑی تھی۔ خوب چند دیر تک اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر گھوم کر ایزل پر تصویر شروع کرنے لگا۔ لاچی یکایک اچھل کر لکڑی کے اسٹول سے نیچے آگئی۔

خوب چند نے گھبرا کے پوچھا۔ کیا ہے۔

کچھ نہیں میرے ٹخنوں پر خارش ہوتی ہے۔ یہ کہہ کر لاچی اپنے ناخنوں سے اپنے ٹخنے کھجانے لگی۔ خوب چند اس کی بے تکلف معصومیت پر مسکرا دیا۔

گیارہواں باب

لاچی کے مقدمے نے اسٹیشن یارڈ کے علاقے کے لوگوں کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کر دیا تھا۔ پولیس کی دوڑ دھوپ۔ اخباری رپوٹروں کے انٹرویو۔ خانہ بدوشوں کے قبیلے کی تصاویروں نے خاصہ ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ جتنے مُنھ اتنی باتیں۔ کچھ لوگ لاچی کی بہادری کی تعریف کرتے تھے۔ اور اکثر اس کے خلاف تھے۔ لاچی نے سماج اور قبیلے کے قوانین کو توڑا تھا۔ اور یہ دونوں ارادے اتنی آسانی سے اُسے معاف کر دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ پلاسٹک مل کے مالک کا نام بھی اس مقدمے کے دوران میں لیا گیا تھا۔ اور اس کی گواہی بھی ہوئی تھی۔ پلاسٹک مل کا مالک اس علاقہ کا سر برآوردہ آدمی تھا۔ اس نے اس مقدمہ سے نکلنے کے لئے اپنا پورا رسوخ استعمال کیا تھا۔ صرف یہی نہیں۔ اس نے اس بات کی بھی پوری کوشش کی تھی کہ لاچی کسی طرح اس مقدمے کے چنگل سے نہ بچ نکلے۔ حالاں کہ لاچی کے دیرینہ بیان اور اقبالِ جُرم کے بعد اس کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ پھر پلاسٹک مل کے مالک کی کوشش یہی رہی کہ لاچی کو اس مقدمے میں زیادہ سے زیادہ سزا ہو۔ مردوں کا سماج ہو یا مردوں کا قبیلہ ہو وہ عورت کے بہت سے گناہوں کی پردہ پوشی کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ ہرگز ہرگز یہ گوارہ نہیں کرتے کہ کوئی عورت ان سے باغی ہو کر اپنی حُرمت کی حفاظت کے لئے لاچی کی طرح زندگی کی بازی لگا دے۔ کیوں کہ اس کا اثر دوسری عورتوں پر پڑا تھا۔ نوجوان عورتوں نے ایک ایک کر کے بُرے دھندے سے انکار کر دیا۔ ان کے شوہر خفا

تھے قبیلے کا سردار خفا تھا ۔ قبیلے کی بوڑھی عورتیں خفا تھیں لیکن لاچی کی دیرینہ مدافعت نے صدیوں کی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں اور وہ طوفان جو ہر عورت کے سینے میں لہریں لیتا تھا سینہ توڑ کر باہر آگیا تھا۔ اور غم وغصہ سے بپھری ہوئی نوجوان خانہ بدوش عورتوں کے چہروں پر کھیل رہا تھا ۔ اب وہ مرغی چرائیں یا کوئلہ چرائیں ۔ ٹوکریاں بُنیں یا چاندی کے چھلے بیچیں ۔ یا محنت مزدوری کا کوئی اور کام کریں لیکن وہ اپنی عزت بیچنے پر تیار نہ تھیں ۔ اور اب وہ طعنے دے دے کر اپنے خاوندوں کو شرم دلانے لگیں کہ محنت کرنا سیکھیں تین لڑکیاں تو قبیلے سے بھاگ گئی تھیں ۔ اور انھوں نے شہر کے غریب لیکن محنتی نوجوانوں سے شادیاں کرلی تھیں ۔ قبیلے میں پھوٹ پڑگئی تھی اور طوفان کے پہلے ہی ریلے میں پرانے رسم ورواج خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے تھے اور اٹھتی ہوئی بغاوت کی موجوں کے زور نے اس قبیلے کو اس کی مرضی کے خلاف بیسویں صدی کی طرف دھکیل دیا تھا ۔ یونہی ہوتا ہے ۔ اور بہت سے لوگوں کی زندگی میں ہر دور میں اور ہر سماج میں یونہی ہوتا ہے ۔ یعنی وہ آگے بڑھنا نہیں چاہتے ۔

اپنی زنجیروں سے ۔ اپنی عادات سے ۔ رسم ورواج سے ۔ اندھے مذہبی سماجی عقائد سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں ۔ لیکن بغاوت کی قوتیں انھیں اپنے طوفان کے ریلے میں بہا کر آگے منزل کی طرف دھکیل کر روانہ کر دیتی ہیں ۔ اور ان میں اتنی شدت اور قوت ہوتی ہے کہ ہر قدم پر پرانے توہمات کا سہارا لینے والا انسان اپنی مدافعت نہیں کرسکتا اور آگے بڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔

قبیلے پر جو ردعمل ہوا تھا اس نے اسٹیشن یارڈ کے سارے علاقے کے سماج میں ایک کھلبلی سی پیدا کر دی تھی ۔ مختلف قوتیں جمع ہو کر قبیلے کے خلاف حرکت کر رہی تھیں ۔ اور یہ بہت ہی آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پہ ہوا ۔ قبیلے کی عورتیں علاقے کے اوباش لوگوں کے لئے ایک بہت بڑا سہارا تھیں ۔ اور بڑا سستا سہارا تھیں ۔ قبیلے کی نوجوان لڑکیوں کی بغاوت سے دلالوں کے پیشے پر کاری ضرب پڑی تھی ۔ پھول والوں کی دکانوں کی بکری کم ہوگئی ۔ رات پالی کرنے والی ٹیکسیوں کا دھندا کم ہوگیا ۔ اور ناجائز شراب بیچنے والوں کے کاروبار پر اثر پڑا ۔ اس کے ساتھ پلاسٹک مل مالک کی دشمنی ملا لیجئے ۔ جن کا علاقے کے ہر کونے میں اثر ورسوخ تھا ۔ تو قبیلے کے خلاف لوگوں کے دلوں

میں نفرت کا جذبہ بڑھ رہا تھا اس کی ایک ہلکی سی تصویر ذہن میں آجائے گی۔

دھیرے دھیرے لوگوں نے یہ سوچنا شروع کیا اس قبیلے کا فائدہ کیا ہے۔ یہ قبیلہ ہمارے علاقے میں اتنے عرصے سے بے اطمینانی پھیلا رہا ہے۔ اس طرح سوچنے والے بہت سے لوگ تھے۔ اور طرح طرح کے لوگ تھے۔ اور صرف بُرے ہی لوگ نہ تھے جنھیں قبیلے کی عورتوں کے رویے نے تکلیف پہنچائی تھی۔ لاچی کے مقدمے سے شہ پاکر شریف لوگ بھی میدان میں آگئے تھے۔ شریف گھرانوں کی عورتوں اور بہوؤں نے بھی اپنے خاوندوں کو محض اپنے تحفظ کی خاطر اس قبیلے کے خلاف اکسادیا تھا۔ جب تک یہ قبیلہ یہاں رہے گا انھیں اپنے خاوندوں کے بہک جانے کا ڈر تھا۔ لاچی کے مقدمے نے قبیلے کی گندگی سطح پر اُچھال دی تھی۔ اب ہر شریف آدمی اور ہر بُرا آدمی اپنی ناک پر رومال رکھے ہوئے اس کی عفونت سے بیزار نظر آتا تھا۔

یہ لوگ چور ہیں۔

ڈاکو ہیں۔

جرائم پیشہ ہیں۔

آوارہ مزاج ہیں اور کام چور ہیں۔

سوسائٹی پر بدنما دھبہ ہیں۔

یہ لوگ ہمارے علاقے میں کیوں پڑے ہوئے ہیں۔

میونسپلٹی نے آخر انھیں کیوں پناہ دے رکھی ہے۔

ریل کی پٹری ان لوگوں کی حرکتوں کی وجہ سے خطرے میں ہے۔ ان لوگوں کا دین ایمان نہیں ہے۔ یہ لوگ کسی وقت بھی دیش اور قوم کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

جتنے مُنھ اتنی ہی باتیں۔

دھیرے دھیرے جوں جوں مقدمہ اختتام کو پہنچتا گیا۔ ان لوگوں کا جوش قبیلے کے خلاف شدید ہو گیا۔ اپنی عفونت کو چھپانے کے لئے ہر الزام خانہ بدوشوں پر لگایا جانے لگا۔ یہ تو لوگ بھول گئے

کہ ہر لغزش کرنے والی عورت کے بالمقابل شریف سوسائٹی کا ایک مرد کھڑا تھا۔ لیکن یہ تمام افراد بجید شریف گھر والے۔ نوکریوں والے یا کام کاج کرنے والے یعنی ان کے اپنے آدمی تھے۔ اس لئے سب آدمی اپنی عزت بچانے کے لئے تُل گئے۔ اور قبیلے کے خلاف غیض وغضب کا مظاہرہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ ہر سماج اپنے گناہ چھپانے کے لئے کسی باہر والے کو قربانی کا بکرا بناتا ہے۔ ذات سے باہر یا سوسائٹی سے باہر یا ملک سے باہر یا قوم سے باہر یا عقیدے سے باہر۔ اس بکرے کی ضرورت ہر سوسائٹی میں یکساں ہے اور اس بکرے کے بغیر کوئی سوسائٹی یا سماج چاہے وہ پسماندہ سے پسماندہ یا ترقی یافتہ ہو۔ چل نہیں سکتا۔ خاص خاص بحرانی کیفیتوں میں اس بکرے کی ضرورت ہمیشہ پیش آتی ہے۔ اس بکرے کی جان لے کر۔ اس کا لہو پی کر ہر سماج ایک طرح سے گویا اپنی تجدید حیات کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ انسانی تاریخ اگر ایک طرف شہیدوں کے خون سے روشن ہے تو دوسری طرف بکروں کے لہو سے بھرپور سُرخ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شہیدوں کا ذکر لوگ فخر سے کرتے ہیں۔ لیکن بکروں کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔ اور کبھی بکروں کا ذکر ناگزیر ہو جائے تو شرم سے سر جھکا کر سرگوشیوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ وجہ کہ لوگ اپنے شہیدوں کے نام تو جانتے ہیں۔ لیکن اپنے بکروں کے نہیں۔

جس دن لاچی کو سزا ہوئی۔ اور علاقہ کا مُنھ کالا ہوا اور مقدمہ کی ساری روداد اور جج کا فیصلہ اخباروں میں چھپا۔ علاقے کے لوگوں کی خفت بڑھنے لگی۔ دھیرے دھیرے سرگوشیاں شروع ہوئیں لاچی کی سزا کے دس دن بعد حمید ٹیکسی ڈرائیور نے کملا کر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

آج رات کو جشن ہے

کہاں۔؟

کملا کر نے پوچھا۔

اسٹیشن یارڈ کے اس پار۔

یہ کہہ کر حمیدے نے آنکھ ماری۔ کملا کر کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ لیکن جو کچھ اس نے سمجھا وہ اتنا کافی تھا کہ اسے مزید دریافت کرنی حاجت نہ ہوئی۔

کچھ ساتھ لیتا آؤں۔

ہاں!

اور!

اور کیا آدھی بوتل چڑھا کے آنا۔ ورنہ جشن میں لطف نہ آئے گا۔

مادھو فروٹ والے سے پان والے نے کہا۔

آج رات کو جشن ہے۔

مادھو چونک پڑا۔

ہوں۔

ہاں۔

کب۔

آدھی رات کو چلو گے۔

چلوں گا۔ مادھو کی بوٹی بوٹی فرطِ شوق سے کانپنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد مادھو نے پوچھا۔

اکیلا آؤں۔

اگر کوئی دوست نہ ملے تو اکیلے ہی آجانا۔ لیکن اگر کچھ لوگ ساتھ لاؤ تو بہت ہی اچھا ہوگا۔

میرے دوستوں میں دس بارہ دودھ بیچنے والے لاٹھی بھکیت بھیّا بھی ہیں۔ اگر کہو تو انھیں بھی ساتھ لیتا آؤں۔ ضرور ضرور سب کو ساتھ لیتے آؤ۔ بڑا مزا رہے گا۔

پلاسٹک مل کے مالک نے شہر کے ایک اڈّے پر فون کیا۔

چنتامنی! آج ہی سب آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔

چنتامنی ہر طرح کا دھندا کرتا تھا۔ چرس کا۔ افیم کا۔ گانجے کا۔ کوکین کا قماربازی کا۔ بُری عورتوں کا۔ شراب کا۔ قتل کا۔ بے حد شریف۔ قابلِ اعتبار اور ایماندار مجرم تھا۔ کئی بار

شہرہ رہ چکا تھا۔ اس لئے جرائم کی دنیا میں اس کی شرافت اور کاروبار کی دنیا میں ایمانداری مسلّم تھی۔
اس نے فون پر کہا۔
کس وقت چاہئیں مالک۔
آج رات کے دس بجے۔ اگر وہ مل کے پھاٹک پر آجائیں تو انھیں ہر طرح کی ہدایات مل جائیں گی۔
بہت اچھا مالک۔
کہہ کر چنتامنی نے فون کا رسیور رکھ دیا۔ اور انتظام کرنے میں مصروف ہو گیا۔
جشن کا وقت قریب آنے لگا۔

شام ہوتے ہوتے۔ دھیرے دھیرے اسٹیشن یارڈ کے علاقے میں لوگ دو۔ دو۔ چار۔ چار دس دس کی ٹولیاں میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ فضا میں جیسے بجلی مضطرب سی لہریں گھوم رہی ہوں۔ بجی سے بجی آدمی بھی ہوا سونگھ کر کہہ سکتا تھا۔
آج کچھ ہونے والا ہے۔ آج کچھ ہونے والا ہے۔

جوں جوں لوگوں کی ٹولیاں بڑھتی جا رہی تھیں پولیس والے کم ہوتے جا رہے تھے۔ گیارہ بجے تک پر پولیس کا ایک آدمی بھی نظر نہ آتا تھا۔ آج سرِ شام ہی سے علاقے کی دکانیں بند ہو گئی تھیں لیکن لوگوں کی ٹولیوں سے اندازہ ہو جاتا تھا جیسے کسی میلے کا اہتمام ہوا ہو۔ گلی کے کونوں میں کسی نے کچھ کہا۔ مگر سب حد مبہم اور پُراسرار کوئی بات واضح اور صاف نہ تھی۔ کیونکہ بیشتر لوگوں کو کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ بس یہی معلوم تھا کچھ ہوگا۔ آج شب کو کچھ ہوگا۔ کب ہوگا۔ کیسے ہوگا۔ کس وقت ہوگا۔ کہاں ہوگا اس کے متعلق کوئی مصدقہ اطلاع نہ تھی۔ اکثر اس قسم کے موقعوں پر یہی کیا جاتا ہے۔ لوگوں کو ایک پُراسرار تذبذب میں رکھ کر ان کی بے چینی کو کھولتے ہوئے نقطے پر لے جا کر ان کا اضطراب کا آدھار یک لخت موڑ دیا جاتا ہے۔ اُدھر جدھر پلان کرنے والے چاہتے ہیں۔ آگے چل کر اب (MOB) کی نفسیات اپنا کام کرتی ہے۔ بُرا ہو یا بھلا۔ اس کے بارے میں اس وقت سوچنے کی ضرورت

کیسے ہوتی ہے۔ صرف سوچنے والوں نے پہلے سوچا ہوتا ہے جبکہ شامل ہونے والے لوگ بعد میں سوچا کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے پہلے سے سب کچھ سوچا اور سمجھا ہوتا ہے وہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ یہ بعد میں سوچیں گے جب بہت دیر ہو جائے گی اور پہلے سے سوچنے والوں کا کام بن چکا ہوگا۔
کوئی دس بجے کے قریب چنتامنی اپنے آدمیوں کو لے کر مل کے پھاٹک پر پہنچ چکا تھا۔ یہاں پر اسے جو ہدایات ملیں وہ یہ تھیں۔ کہ وہ اپنے آدمیوں کو شراب پلائے۔ اسے اس کام کے لئے پیسے بھی دیئے گئے۔ اس کے بعد شراب پلانا کیا مشکل تھا۔ قریب ہی درختوں کے جھنڈ میں سامنے جو چھپر نما گھر تھے۔ ان میں دیسی شراب کی کشید ہوتی تھی۔ جس سے کارخانہ میں کام کرنے والے لوگ کبھی کبھی اپنے تھکے ہوئے اعضاء کو سکون پہنچایا کرتے تھے۔ یہ لوگ دس سے بارہ بجے تک ان چھپروں میں بیٹھے شراب پیتے رہے تلی ہوئی مچھلی اور کباب کھاتے رہے۔ شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ اور لوگوں کی گفتگو کا دھارا سمندر کی طرح موجیں مار رہا تھا۔
جب عقل سلیم کے سارے اجزاء الکوحل میں حل ہو گئے تو چنتامنی کو دوسری ہدایت ملی۔ اور روپیہ بھی اس کی جیب میں پہنچا دیا گیا۔
چنتامنی اپنے قابل اعتماد لفٹیننٹ سورج کو چھپروں میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ تین آدمی اس نے اپنے ساتھ لئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب واپس آیا تو ان لوگوں کے پاس مٹی کے تیل کے بڑے بڑے پیپے تھے۔ اور آگ لگانے کا ضروری سامان تھا۔
رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب آخری میل اسٹیشن سے گزر گیا۔ اور اس کے بعد آنے والی گاڑی تین گھنٹے کے بعد آتی تھی۔ اس وقت اسٹیشن یارڈ کے دوسرے سرے سے آگ کے شعلوں کا لپکا سا بلند ہوا۔ اور کسی نے چلا کر کہا۔
خانہ بدوشوں کے خیموں میں آگ لگ گئی۔
پھر اسی وقت حمیدے نے چلا کر کہا۔
یا علی۔

مادھو کی ٹولی لاٹھیاں اُٹھا کر دوڑی۔ اور ہر ہر مہادیو کے نعرے لگاتے ہوئے اسٹیشن کے اندر بلا ٹکٹ گھس گئی۔ اور ریل کی پٹریاں پار کرتے ہوئے خانہ بدوشوں کے قبیلے کی طرف بڑھنے لگی۔

لوگ لاٹھیاں گھماتے اور چاقو کھولے دوڑ رہے تھے لوہے کے جنگلے سے سلاخیں نکال لی گئیں۔ چھپروں سے لکڑیاں نکال لی گئیں۔ ہر شخص کے مُنھ سے شراب کی بو آتی تھی۔ آنکھوں میں درندوں کی سی چمک تھی۔ اور ٹانگوں میں بھیڑیئے کی سی تیزی تھی۔ اور نتھنے پھولے ہوئے۔ شکار کو سونگھتے ہوئے۔ دو منٹ میں اپنی تہذیب کے سارے پردے چاک کر کے انسان جنگل کی فضا میں پہنچ گیا تھا۔ اور چوکریاں بھرتا ہوا شکار کی تلاش میں دوڑا جا رہا تھا۔ وہ لوگ کون تھے۔ ان سے ان کی کیا دشمنی تھی۔ ان لوگوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ یہ سب خیال اس وقت دب گئے تھے۔ صرف ایک منزل سامنے تھی۔

شکار۔

شکار۔

شکار۔

جنگل کا خون پکار رہا تھا۔

گل پرانے پل سے دیکھ رہا تھا۔

خانہ بدوشوں کے خیموں سے بھرے ہوئے میدان کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔ ان کے خیموں میں آگ لگائی جا رہی تھی۔ خانہ بدوش بڑی جیداری سے لڑ رہے تھے۔ لیکن وہ لوگ تعداد میں بہت کم تھے۔ اور حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ حملہ اچانک ہوا تھا۔ رات کی تاریکی میں ہوا تھا۔ اس لئے خانہ بدوشوں کی بستی میں ہراس پھیل گیا تھا۔ خانہ بدوش کے بچے چیخ رہے تھے۔ خانہ بدوش عورتیں اِدھر اُدھر بھاگی پھر رہی تھیں۔ اور اپنی اپنی مدافعت میں ہاتھ پاؤں چلا رہی تھیں۔ گل پل پر سے دیکھ رہا تھا۔ یکایک عجیب سی حدت اس کے دل سے اُٹھی۔

یہ اس کے دشمنوں کا قبیلہ تھا۔ پھر بھی اس کی لاچی کا قبیلہ تھا۔ وہ لاچی جو اس کی وجہ سے جیل میں تھی۔ اسی قبیلے میں اس کے ماں باپ تھے۔ بہت بُرے بیحد بُرے پھر بھی اس کی لاچی کے ماں باپ تھے۔

وہ پُل پر کھڑا کھڑا کانپنے لگا۔

اور پھر دوسرے لمحے میں تیز تیز قدموں سے نیچے میدان کی طرف چلا گیا۔ لیکن گُل وہاں کیا کر سکتا تھا۔ وہ لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ اور گُل اکیلا تھا۔ اکیلا آدمی کتنے آدمیوں سے لڑ سکتا ہے۔ جب لاٹھی کا ایک اوچھا وار اس کی ٹانگ پر پڑا وہ کونے میں گر گیا اور چکرا کر اندھا ہو گیا۔ اگلے چند لمحوں میں دو چار قدم اس کے جسم کو روندتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اسے ان قدموں کے بوجھ کا اتنا احساس نہ تھا۔ جس قدر اپنی ٹانگ میں درد کا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا واپس پُرانے پل کو ہو لیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ پولیس کو فون کرے۔ لیکن اب اسے یہ سب کچھ بیکار معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس بلندی سے اس بستی کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ جہاں انسان بستے تھے۔

خانہ بدوشوں کے خیمے جل رہے تھے۔

لوگ مشعلیں اٹھائے خانہ بدوشوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ بہت سے خانہ بدوش اور ان کی عورتیں بھاگ گئی تھیں۔ بچے ڈرے ہوئے۔ سہمے ہوئے اور ڈر رہے تھے۔ اور معصومیت میں حملہ آوروں سے اپنے ماں باپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔

ایک غنڈے نے ایک خانہ بدوش عورت کو پکڑ لیا۔ اور وہ چاقو سے چیر چیر کر اس کے کپڑے اُتار رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے بھی اس کے کپڑے اُتار سکتا تھا۔ مگر شاید اسے چاقو سے چیرنے میں زیادہ مزہ آ رہا تھا۔ وہ ایک ایک کپڑا چیر کر خانہ بدوش عورت کو ننگا کر رہا تھا۔ ہوتے ہوتے اس خانہ بدوش عورت کے گرد غنڈوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ وہ لوگ شراب کی بوتلیں مُنہ سے لگائے خوشی سے ناچ رہے تھے۔ گُل نے اپنے ہاتھ۔ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے پھر دوڑتا ہوا اسٹیشن یارڈ سے باہر نکل گیا۔ اور سیدھا پولیس چوکی کی طرف چلا گیا۔ مگر پولیس کے آنے سے

پہلے غنڈوں کو خبر ہو چکی تھی۔ اور جب تک پولیس آئے غنڈے اپنا کام کر کے وہاں سے جا چکے تھے
چنانچہ جب پولیس واردات کے موقعہ پر پہنچی تو اسے ایک مجرم بھی نہ ملا۔
میدان صاف تھا۔
خانہ بدوش کے خیمے جل رہے تھے۔
پانچ چھ خانہ بدوش سخت زخمی حالت میں پڑے کراہ رہے تھے۔
ٹوٹی ہوئی صراحیاں۔ گھڑے۔ تلے۔ ایلومونیم کے برتن میدان میں بکھرے پڑے تھے۔
چھوٹے چھوٹے بچے مختلف کونوں میں چھپے ہوئے سسک سسک کر رو رہے تھے۔ بچے جن کی آنکھوں کے سامنے اُن کی ماؤں کی بے حُرمتی کی گئی تھی۔ اُن کے باپوں کو مارا پیٹا گیا۔ شیطان کے چیلے درندگی اور بربریت کا رقص تمام کر کے وہاں سے جا چکے تھے۔ مظلوم وہاں موجود تھے۔ لیکن مجرم کہیں نظر نہ آتا تھا۔
پولیس فوراً بیانات قلم بند کرنے لگی۔ سپاہی سنتری ناکوں اور علاقے کے کوچوں میں گشت کرنے لگے۔ چند لوگ گرفتار بھی کئے گئے۔ لیکن ان میں بیشتر وہ لوگ تھے جو اس واردات میں شامل نہ تھے۔ بلکہ اپنے گھروں میں سوئے ہوئے تھے۔ اور جنھیں اس واقعے کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔
بکرے۔

دوسری صبح کو خانہ بدوشوں کا قبیلہ وہاں سے جا چکا تھا۔ میدان خالی تھا۔ وہاں چند جلے ہوئے خیمے اور چند گڑھے اور کچھ قدموں کے نشان۔ دس بارہ روز میں یہ بھی مٹ جائیں گے اور وہاں خونچکاں داستان کا کوئی نشان بھی نہ رہے گا۔
خانہ بدوش اسٹیشن کے علاقے کو خالی کر گئے۔ ہمیشہ کے لئے۔ اب وہ پھر کبھی واپس نہ آئیں گے۔ خدا جانے وہ کدھر جائیں گے اور کہاں اپنا ڈیرہ جمائیں گے۔ مگر وہ اس علاقے میں واپس نہ آئیں گے۔ علاقے کے لوگوں نے اس بدنما دھبّے کو ہمیشہ کے لئے اپنے

علاقے سے ہٹادیا تھا۔ اور اب علاقہ میں کسی طرح کی بے اطمینانی نہ تھی۔ دوسرے دن دکانیں بڑے اطمینان سے کھلیں۔ لوگ باگ آنے جانے لگے۔

پان والے۔

فروٹ والے۔

ٹیکسی والے۔

سب اپنے اپنے گاہکوں کی مانگ پوری کرنے میں مصروف تھے آگ لگانے والے بس کے کیو میں کھڑے ہو کر اپنے گھر کے لئے تھیلیوں میں کچھ لے جا رہے تھے۔ جن لوگوں نے کل رات خانہ بدوش عورتوں کی بے حرمتی کی تھی وہ اس وقت سبز پتوں میں پھولوں کی وینیاں لئے ہوئے اپنی عورتوں کے لئے لے جا رہے تھے۔ زندگی بالکل ٹھیک تھی۔ اور درست تھی اور صحیح تھی۔ اور بالکل اسی طرح تھی جس طرح اسے ہونا چاہئے تھا۔ صرف گل کو کچھ کچھ عجیب سا معلوم ہوا تھا۔ اور جب ملاقات کے دن اس نے لاجی سے مل کر یہ سب کہا تو اس کا دل تڑپنے لگا۔ اور اس کے دل میں ایک نامعلوم سڑک یاد آئی۔ جو پہاڑوں اور میدانوں اور وادیوں میں سے گزرتی ہوئی جاتی ہے اور جس پر خانہ بدوشوں کا قافلہ کسی موہوم منزل کی تلاش میں ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔

اس نے گھبرا کر گل کے سینے پر سر رکھ دیا۔

اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بارہواں باب

خوب چند نے منع کر دیا تھا پھر بھی لاچی کی تصویر کی بات آہستہ آہستہ ساری جیل میں پھیلتی گئی۔ عورتوں کی جیل میں جب اس بات کا پتہ چلا تو بہت ساری عورتیں جیناں بائی کے توسط سے لاچی کو دیکھنے کے لئے آنے لگیں۔ اور اس سے دوستی کی خواہش ظاہر کرنے لگیں۔ ان میں مشہور فلم اسٹار دل آرا بھی تھی۔ جسے دھوکا دینے کے جرم میں ساڑھے تین سال کی قید کی سزا ہوئی تھی۔ دل آرا کا قد لاچی کے قد سے بھی لانبا تھا۔ جلد آئینے کی طرح شفاف تھی۔ رخساروں پر گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور آنکھوں میں کنول کی سی پاکیزگی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی ایک لمحے کے لئے بھی خیال نہیں کر سکتا تھا کہ یہ عورت کسی طرح کا دھوکا کر سکتی ہے۔ اس لئے جب وہ پہلی بار لاچی کو اس کے جرم کی تفصیل سن کر بڑا اچنبھا ہوا۔ وہ اس وقت سرکل کے میدان میں پیڑ کے نیچے گھاس چھیل رہی تھی۔ جب جیناں دل آرا کو اس کے پاس چھوڑ گئی۔ تو دونوں عورتیں کھرپے لے کر گھاس چھیلتے چھیلتے باتیں کرنے لگیں۔

لاچی نے مسکرا کر کہا۔

تم تو ایسی لگتی ہو کہ تم سے دھوکا کیا جا سکتا ہے تم کسی کو دھوکا نہیں دے سکتیں۔

دل آرا ہنس کر بولی۔

نہیں میں نے تو واقعی دھوکا دیا تھا۔ وہ سندھی سیٹھ بڑا چالاک بنتا تھا۔ میں نے اس سے

تیس ہزار روپے اینٹھ لئے۔

کاہے کے لئے۔

مجھے روپوں کی ضرورت تھی۔

لاچی کو اپنی بات یاد آئی۔

دوست سے روپوں کی ضرورت یوں تو ہمیشہ رہتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی بڑی رقم کی ضرورت بھی پڑ جاتی ہے۔ ایک معمولی سی رقم کے لئے اس نے خون کر دیا تھا۔ اب تیس ہزار کے دھوکے میں کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ضرور کوئی اہم معاملہ ہوگا۔ جبھی تو اس عورت نے اتنا بڑا دھوکا کیا۔

لاچی

اس نے پوچھا۔ تم فلم میں کام کر کے کتنا کما لیتی ہو۔

میں پندرہ بیس ہزار روپے مہینہ کما لیتی ہوں۔

پھر تم نے تیس ہزار روپے کا دھوکا کیوں کیا۔

میں ایک گاڑی خریدنا چاہتی تھی۔ ایک مہارا جہ اسے ساٹھ ہزار روپے میں دے رہا تھا۔ اور وہ ایسی پیاری گاڑی تھی کہ ساٹھ ہزار میں بھی سستی تھی لیکن اتنی رقم میرے پاس نہ تھی۔ اور یہ سندھی سیٹھ ایک عرصہ سے میرے پیچھے پڑا تھا۔ میں نے اسے بے وقوف بنایا۔

ایک گاڑی کے لئے۔ کیا تمھارے پاس اس سے پہلے کوئی گاڑی نہ تھی دو تھیں۔ مگر میں تو یہ نئی والی گاڑی لینا چاہتی تھی۔ اور تم دیکھو گی اسے۔ تو جان نکل جائے گی۔ کیسی پیاری سوئٹ گاڑی ہے۔ سلور گرے۔

دل آرا نے کھرپی چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ فرطِ مسرت سے اپنے سینے پر رکھ لئے اس کی ہتھیلیوں میں سلور گرے گاڑی چمک رہی تھی۔

لاچی بہت دیر تک کچھ نہ بولی۔

وہ سر جھکائے کھرپی سے گھاس کھودتی رہی۔

اس کی بہنیں تھیں جو پُرانے رسم و رواج میں جکڑی ہوئیں۔ غربت اور بھوک اور جہالت کا شکار اگر وہ عورتیں چوری کرتی تھیں۔ دھوکا کرتی تھیں تو یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ یہ ایک نئی گاڑی کے لئے دھوکا دینے کی بات لاچی کی سمجھ میں نہ آئی۔ اور جب کسی کے پاس دو گاڑیاں پہلے سے موجود ہوں۔ لاچی نے نگاہ اُٹھائی۔ دل آرا کو دیکھا کتنی پیاری خوب صُورت سی لڑکی تھی۔ یقیناً کوئی موٹر اس سے زیادہ خوب صُورت نہیں ہو سکتی انسان ایک بڑھیا خوب صورتی کو بیچ کر ایک گھٹیا خوب صورتی کیوں مول لیتا ہے۔ یہ کیسا سودا ہے۔

یکایک لاچی نے غصّے سے کہا۔

تمھیں ایک ذلیل لوہے کی گاڑی کے لئے دھوکا دیتے شرم نہ آئی۔

دل آرا نے لاچی کی طرف بڑے اطمینان سے دیکھا۔

اسے ذرا غصّہ نہیں آیا۔ پھر وہ ذرا مُسکرائی۔ مگر جب تک اس نے لاچی کی آنکھوں سے ایمان اور صداقت کے شعلے نکلتے دیکھے تو وہ ان کی چمک کی تاب نہ لا سکی۔ اس کی آنکھیں نیچی جھک گئیں۔ وہ گھاس کی جڑ سے بھُوری مٹی جھاڑتے ہوئے بولی۔ میں جب سات سال کی تھی تو پہلی بار بیچی گئی تھی۔ خود میرے ماں باپ نے مجھے آٹھ سو روپوں میں بیچ دیا تھا۔ تُم یقین نہیں کرو گی۔

کر سکتی ہوں۔ لاچی بولی۔ ہمارے یہاں بھی ہوتا ہے۔ خود مجھے ہو چکا ہے۔

سات سال سے سترہ سال تک میں دس بار بیچی گئی ہوں۔ ہر سال میرا باپ بدل جاتا تھا ہر سال میرا ایک نیا خریدار مجھے خریدتا تھا۔ ہر سال میری قیمت بڑھ جاتی تھی۔ کیوں کہ میں بہت خوب صورت ہوں نا!

ہاں تم بہت خوب صورت ہو۔ لاچی نے کہا۔ بالکل گُڑیا معلوم ہوتی ہو۔

دل آرا بولی۔

جب میں چھوٹی تھی تو میرے خریدار میرے ماں باپ بن جاتے تھے۔ جب میں بڑی ہوئی تو وہی میرے شوہر ہونے لگے۔ جب میں فلم میں آئی تو کوئی ماں نہ رہی کوئی باپ نہ رہا۔ کوئی شوہر نہ رہا۔

دل آرا نے چونک کر پوچھا۔ کیا بات ہے۔

ادھر ایک پروڈیوسر تم سے ملنے کے لئے آیا ہے۔

دل آرا نے کھرپی چھوڑ دی۔ روش کے کنارے لگے ہوئے پانی کے نل سے ہاتھ دھوئے اور چیناں بائی کے ساتھ کالی چرن کے دفتر کو چلی گئی۔

کالی چرن کے دفتر میں حاجی عبدالسلام اور میر جنیدانی دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ دل آرا اندر آکر میر جنیدانی کی بغل میں بیٹھ گئی۔ اور اس کے سگریٹوں کے ڈبے میں سے ایک سگریٹ نکال کے پینے کے لئے اپنے منہ میں لگا لیا۔ حاجی اور میر جنیدانی دونوں نے اپنے لائٹر جلائے۔ اور آگے بڑھائے دائیں بائیں دل آرا کے سامنے دو لائٹر تھے۔ دل آرا نے دونوں طرف دیکھا۔ پھر اس نے حاجی کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور میر جنیدانی کے لائٹر پر جھک گئی۔ ایک لمحے کے بعد اس کے پتلے پتلے ہونٹوں سے دھوئیں کے نازک نازک سے مرغولے نکلنے لگے۔ حاجی دل آرا کو بہت چاہتا تھا۔ اس کے لئے رات دن آہیں بھرتا تھا۔ وہ اس کے لئے بیس ہزار روپئے تک خرچ کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر دل آرا سے جب بات کرو۔ ایک لاکھ کی بات کرتی تھی۔ اب یہ محبت ہے حاجی نے سوچا۔ بزنس تو ہے نہیں کہ آدمی ایک لاکھ چھوڑ کر دس لاکھ کا جوا بھی کھیل جائے۔ بزنس میں رسک تو لینا پڑتا ہے۔ لیکن محبت میں اتنا رسک کون مول لے۔ اب پندرہ بیس ہزار کی بات ہو تو خیر چلئے۔ اس رقم کو دل آرا پر قربان کر دیتا۔ مگر یہ کم بخت تو محبت کو بزنس بنائے بیٹھی تھی۔ اب اسے یہ کون سمجھائے کہ محبت محبت ہے اور بزنس بزنس ہے۔ بزنس کو بزنس کے طریقے پہ چلانا چاہیئے اور محبت کو محبت یعنی تفریح کے انداز میں دیکھنا چاہیئے۔ کوئی اور مل جائے گی دنیا میں عورتوں اور محبتوں کی کیا کمی ہے۔

اور میر جنیدانی تو ایک پیسہ دلوال نہ تھا۔ اسے دل آرا سے محبت ہی نہ تھی وہ اسے ایک خوش ذوق انسان کی نظر سے دیکھتا تھا۔ چند خوش گوار لمحوں کا ساتھ دینے والی ساتھی! دونوں

دلال بن گئے ۔ کیا یہ دھوکا نہیں ! اور اخلاق کیا ہے ۔ اس کا مجھے پتہ نہیں !

مگر مجھے معلوم ہے ۔ لاچی نے بڑے اعتماد سے کہا ۔

کچھ دیر تک دونوں خاموش رہیں ۔

گھرپیاں آہستہ آہستہ چلتی رہیں ۔

پھر لاچی نے پُوچھا ۔ کیا میں فلم اسٹار بن سکتی ہوں ۔

ذرا کھڑی ہو جاؤ ۔ دل آرار نے اشارہ کیا ۔

لاچی گھرپی پھینک کر پیڑ کے نیچے کھڑی ہو گئی ۔ اس کے سامنے دل آرار کھڑی ہو گئی اور شاق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی ۔

ارے تم تو لوٹ کے کھا جاؤ گی ۔

لاچی ہنستے ہوئے بولی ۔ حمید ابھی یہی کہتا تھا ۔

کون حمیدا ۔

ایک ٹیکسی والا ہے اُدھر اسٹیشن پر ۔

ہونھ ۔ دل آرار نے بڑی نخوت سے کہا ۔ وہ ٹیکسی والا تمھیں فلم اسٹار کیا بنائے گا ۔ میں بنا سکتی ہوں ۔ سچ ! مگر اس کے لئے مجھے کیا کرنا پڑے گا ۔ لاچی نے بڑے اشتیاق سے پُوچھا ۔

سب سے پہلے تمھیں اپنی عزت دینی ہو گی ۔

لاچی ٹھس ہو کر پیڑ کے نیچے بیٹھ گئی ۔

تم بھی دل آرار ! تم بھی یہی کہتی ہو ۔ پھر تو یہ جیل اچھی ۔ لاچی نے بڑے استقلال سے کہا ۔ اور گھرپی چلانے لگی ۔

اتنے میں چیناں بائی دوڑتی ہوئی آئی اور دل آرار سے کہنے لگی ۔

چلو اُدھر دفتر میں ۔ کالی چرن صاحب نے تمھیں بلایا ہے ۔

کو بُرج کا بہت شوق تھا۔ اچھے سگریٹوں کا۔ اچھے کپڑوں کا۔ اچھی موٹروں کا۔ اچھی شراب کا۔ عورت اور مرد کے تعلقات تو میر چنداِنی کے لئے ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔ عورتیں میر چنداِنی کو صرف اس لئے اچھی لگتی تھیں کہ وہ خوش وقتی کا ایک بہت بڑا سہارا تھیں۔ ڈرائنگ روم میں ان کے بھولے بھالے روغنی چہرے۔ رنگین ساڑیاں کسے ہوئے جسم اور احمقانہ فقرے کتنے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ آدمی ایک دم سٹہ بازار بلیک مارکیٹ۔ فریب دہی اور چار سو بیس کی انتہائی زیرک دُنیا سے نکل کر ایک دم معصوم۔ نرم ملائم اور شیریں دُنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ بزنس مین ——— کے لئے دن بھر کی جان لیوا محنت اور تھکن کے بعد عورت ایسی ہی ضروری ہے جیسے سر درد کے لئے اسپرو یا اناسین! یا کوئی بھی اس طرح سفید رنگت کی خوب صورت ٹکیہ۔ شفاف چکنے کاغذ میں لپٹی ہوئی۔ عورت اور سر درد کی ٹکیہ کی پیکنگ میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ کم سے کم میر چنداِنی ایسا ہی سمجھتا تھا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ دل آرا اس سے پُورا اتفاق کرتی تھی۔ جس طرح اس کی زندگی گزری تھی۔ جس طرح وہ بیچی گئی اور خریدی گئی تھی۔ سماج کے بازار میں بار بار اس کا سودا کیا گیا تھا اسے مدِنظر رکھتے ہوئے دل آرا کا دل میر چنداِنی کے خیالات کی سو فیصدی تائید کرنے پر مجبور تھا۔

اس نے سگریٹ سلگا کر اپنی بے حد متناسب کلائی میر چنداِنی کے شانے پر رکھ دی اور بڑی معصوم مُسکراہٹ سے حاجی جی کی طرف دیکھ کر بے پروائی سے بولی۔

حاجی چاچا کیا پروگرام ہے۔

کیوں سبے کالیے، تو نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ حاجی کی طرف سے پلٹ کر اس نے کالی چرن کو اپنی نگاہوں کا شکار کیا۔

مردوں کی دُنیا میں عورت ہر وقت تیر کمان سے لیس رہتی ہے۔ بے چاری کیا کرے اس کے قلب و جگر میں نظروں کے نشتر نہ چبھوئے تو وہ اسے دن رات ایسی مراعات کیوں کر دیگا۔ کالی چرن کا دل دل آرا کو دیکھ کر کانپنے لگتا تھا۔ دل آرا کو خوب معلوم تھا کہ وہ کیوں کانپتا

تھا۔ اور کیا چاہتا تھا۔ جس دن اس کی چاہت پُوری کردی گئی اس کا دل نہ کانپے گا نہ چاہے گا۔ وہ غرور سے گردن اُونچی کرے گا۔ فخر سے دُنیا کو دیکھے گا۔ اور تحقیر سے دل آرا کو۔ اس لئے یہی بہتر ہے اس خبیث کو کالیہ کہا جائے۔ اور کبھی کبھی جب وہ بہت جھنجھلانے لگے تو اسے سو پچاس روپے رشوت میں دے دیئے جائیں۔ کیوں کہ کالی چرن تو سراپا لالچی تھا۔ اگر تم اس کی ہوس پوری نہیں کر سکتے تو اس کی حرص کی آگ ہی بجھا دو۔ اس کے لئے بہت سے جذبے متبادل تھے۔ اور آخر میں سب روپے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ عورت کی محبت۔ ماں کی ممتا۔ باپ کی بیماری۔ قیدی کا پیرول۔ عاشق کی مجبوری وہ سب کی طرف چند لمحوں کے لئے تعریفی نگاہوں سے دیکھتا۔ گویا ہر جذبے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کا وزن کرتا۔ اور آخر میں اس پر روپے کا لیبل لگا دیتا۔ اس جذبے کے اتنے پیسے اور اس رعایت کی اتنی قیمت چکا دو۔ کالی چرن تمہارا ہے۔

حاجی عبدالسلام بولے۔ آج بہت دنوں کے بعد دلدار روڈ پر جانے کو جی چاہ رہا ہے۔ گانا سُنیں گے۔

دل آرا تو ایسے کاموں کے لئے تیار رہتی تھی۔ ذرا بولی۔ ارے مزا آجائے گا۔ لکھنؤ میں دو سال میں بھی کوٹھے پر بیٹھی ہوں۔ واہ وا۔ کیا دن تھا وہ۔ پھر سے پُرانی یادیں تازہ ہوں گی۔ ایک ٹھمری میں بھی گاؤں گی۔

تو تم میرے ساتھ چل رہی ہو نا۔

حاجی عبدالسلام نے پکا کرتے ہوئے کہا۔

دل آرا نے مُڑ کر میر چندانی کی طرف دیکھا اور پُوچھا۔

تم نہیں جا رہے ہو۔

میر چندانی بولا۔ میں سوچ رہا تھا۔ آج میں رات کو اپنی بھابی کی بہن کی دیورانی کی جٹھانی کی موسی کے یہاں ہو آتا۔

ارے وہی ڈارلنگ روڈ والی اینگلو انڈین کم بخت نہیں تم نہیں جا سکتے اور اگر تم گئے

تو میں سپرنٹنڈنٹ جیل کو رپورٹ کردوں گی ۔ مجھے ایک ہفتہ ہوا ہے جیل سے باہر نکلے ہوئے ۔
تم کیا چاہتے ہو ۔ میں یہیں گھسٹ گھسٹ کے مر جاؤں ۔

میر چندانی نے سر جھکا دیا ۔

بولا ۔

بہت اچھا میڈم ۔ آج گانا سننے چلیں گے ۔ جہاں کہو گی وہیں چلیں گے ۔

حاجی کا منہ اتر گیا ۔

اس نے میر چندانی سے مل کر پروگرام بنایا تھا کہ میر چندانی تو ڈار لنگ روڈ پر اپنی اینگلو انڈین دوست کے پاس جائے گا ۔ اور حاجی دل آرار کو دلدار روڈ پر گانا سننے لے جائے گا مگر اس کم بخت دل آرار نے سارا پروگرام چوپٹ کر دیا ۔ اب یہ کم بخت جہاں جائے گی میر چندانی کی بغل میں بیٹھے گی ۔ اسے کیا مزہ آئے گا ۔ خاک ! بڑی مشکل سے اس نے کالی چرن کو ..ہ روپے دے کے آج رات کا پروگرام بنایا تھا مگر ـــــ

تو تو پھر میرا کیا ہوگا ۔

بے چارے حاجی نے کہہ ہی دیا ۔

گھبراؤ نہیں چاچا جی ! تمہارے لئے کوئی بندوبست کرتے ہیں ۔

کون ۔

لاچی ۔ دل آرار بولی ۔

لاچی ۔ حاجی نے پوچھا ۔ عورت ہے وہ !

عورت نہیں ہے ۔ ڈائنا مٹ ہے ۔ میر چندانی نے آہستہ سے کہا ۔ پھر اس نے سگریٹ کے لئے ایک ماچس کی تیلی روشن کی اور دیر تک اسے دیکھتا رہا ۔ یہاں تک کہ ماچس بجھ گئی اور سگریٹ جوں کا توں اس کے ہاتھ میں رہ گیا ۔

کالی چرن نے کھانس کر کہا ۔ میں نے سمجھا تھا آپ صرف تینوں ہی جائیں گے ۔ اب

ایک اور بڑھ گیا تو مجھے ایک وارڈرن اور آپ لوگوں کے ساتھ کرنا پڑے گا۔ دوسو روپے اور ہوں گے۔ میر چنڈائی نے جیب سے دوسو روپے کے نوٹ نکال کر کالی چرن کو تھماتے ہوئے کہا۔ یار تم اتنے پیسے لیتے ہو کر رنڈی بھی مُجرا کرنے کے نہ لیتی ہوگی۔

کالی چرن نے گھنٹی بجا کر چپراسی سے کہا۔ جیناں بائی کو بُلاؤ۔

طے یہ ہوا کہ دل آرا نو جیل سے سرکاری طور پر جائے گی کسی فرضی پرو ڈیوسر کی شوٹنگ پر۔ وہ نو نو بجے چلی جائے گی۔ دس بجے کے بعد جب پہرہ بدلے گا تو ایک کالی گاڑی جیل کے باہر میر چنڈائی۔ حاجی عبدالسلام اور لاچی کا انتظار کرے گی۔ تین وارڈرن ان تینوں کے ساتھ ہوں گے۔ اور دو وارڈرن دل آرا کے ساتھ۔ صبح پانچ بجے یہ لوگ پہرہ بدلنے سے پہلے آجائیں گے۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔

دل آرا نے لاچی کو منا لیا تھا۔

اور لاچی اس لئے مان گئی تھی کہ اس نے آج تک کسی طوائف کا کوٹھا نہ دیکھا تھا۔

دل آرا لاچی کو سمجھا بجھا کر رات کو نو بجے جیل سے رخصت ہوگئی باہر سبز رنگ کی ایک گاڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دل آرا نے گاڑی آگے بڑھوا کے جیل کے غربی کونے پر رکوا دی۔ اور باقی لوگوں کا انتظار کرنے لگی۔

دس بجے کے قریب حاجی کی سیاہ کیڈلک میں حاجی۔ میر چنڈائی لاچی اور تین وارڈرن لدے آ پہنچے۔

دل آرا نے سبز گاڑی چھوڑ دی۔

گاڑی میں جگہ نہ تھی۔ چھ آدمی اس میں پہلے سے لدے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ اطمینان سے کیڈلک کے اندر آکر میر چنڈائی کی گود میں بیٹھ گئی اس کے ساتھ دو وارڈرن بھی تھے۔ اس لئے ایک وارڈرن کو آگے بٹھا دیا گیا۔ اور دوسرے وارڈرن کو جگہ دینے کے لئے دل آرا نے لاچی سے کہا وہ حاجی کی گود میں بیٹھ جائے۔

ناں میں نہیں بیٹھوں گی کسی کی گود میں۔

لاچی غصّے سے چلائی۔

ارے یہ نہ منت کی تو بات ہے۔ دل آرار نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ گاڑی میں جگہ
کم ہے۔ اس لئے کہہ رہی ہوں۔ اور پرنس کیٹ بھی یہی کہتا ہے۔

بھلے میں جائے تم لوگوں کا پرنس کیٹ۔ لاچی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس ڈرجیل مائی کی گود میں تو تمہارا وارڈرن ہی بیٹھے گا۔

جب لاچی کسی طرح نہ مانی تو وارڈرن بے چارہ بڑی تنگی سے گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی دلدار
روڈ کو روانہ ہوئی۔

تیرہواں باب

دلدار روڈ پر عجب طرح کا بازار تھا۔ ایک طرف عورتوں کے کوٹھے تھے۔ دوسری طرف لکڑیوں کے ٹال تھے۔ اور پرانے رنگ آلود لوہے کے ٹکڑوں کی دکانیں۔ یہاں ہر طرح کی عورتیں اور ہر طرح کی لکڑیاں بیچی جاتی ہیں۔ لانبی۔ چھوٹی۔ سستی۔ مہنگی ہر قسم کی لکڑی یہاں ملتی تھی۔ بانس کی۔ ببول کی ساگوان کی اور شیشم کی لکڑیاں جنہیں دیمک چاٹ گئی تھی۔

عورتیں جنہیں جنسی بیماری نے کھا لیا تھا۔

کھلے کواڑوں کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی گاہکوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ نالیاں پیشاب کی بو اور شرابیوں کی قے سے اٹی ہوئی تھیں۔ اور ان پر چمیلی کے پژمردہ پھول تیر رہے تھے۔ اور فضا میں طبلے کی تال اور سارنگی کی لے پر جلی بجھی ٹھمریاں اور سستے فلمی گانے مکھیوں کی طرح بھنک رہے تھے۔ اور ان سب کے اوپر تاریک گلیوں کا اندھیرا ایک گناہگار گہرے کی طرح چھایا ہوا تھا۔ یہ عورتیں انسان ہیں کہ لکڑی کی کھپچیاں۔ یہ دلال آدمی ہیں کہ لوہے کے زنگ آلودہ پترے۔ یہ زندگی کے جیتے جاگتے گیت ہیں کہ جہنم اور موت کے نوحے یہ ایسی دنیا کا بازار ہے جسے زندہ انسانوں کی بستی کہا جائے گا یا گم شدہ روحوں کی وادی۔ ایک لمحے کے لئے انسان یہ بھی تو بھول جاتا ہے کہ ایسی دنیا ہے جہاں معصوم بچے ماؤں کی گود میں ہمکتے ہیں۔ جہاں ماتھے پر گھونگھٹ کاڑھے ہوئے سیندور کا ٹیکا لگائے ہوئے پاکباز عورتیں تھالی میں کھانا

پروس کر اپنے تھکے ہوئے شوہروں کے سامنے رکھتی ہیں اوران کی نظریں فرطِ حیا سے جُھک جاتی ہیں۔

لیکایک لاچی کو احساس ہوا جیسے ہر کوٹھے پر وہی گا رہی تھی۔ وہی ناچ رہی تھی وہی بیچی جا رہی تھی۔ اور نہ صرف خالص مردوں کی تہذیب تھی۔ مردوں نے عورتوں کو چہار دیواری میں دھکیل دیا تھا۔ اور خود اپنے ہاتھوں سے بہ بُلند وبالا۔ اُونچے محلوں۔ ہوائی جہازوں اور راکٹوں کی تہذیب بنائی تھی۔ یہ چاند کے دل تک پہنچنے والے لوگ کیا کبھی عورت کے دل تک بھی پہنچ سکیں گے۔

لاچی نے غصّے سے تھوک دیا۔ بولی۔

مجھے واپس جیل لے چلو۔

ابھی تو رات جوان ہے پیاری۔ حاجی نے لاچی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

حاجی کے اندر وسکی کے چار پیگ جا چکے تھے۔ اور وہ بالکل اسی طرح محسوس کرتا تھا جس طرح مرد چار پیگ پینے کے بعد محسوس کرتا ہے۔ لاچی نے اپنی بانہہ اس سے چھڑانی چاہی نرمی سے۔ احتیاط سے۔ شرافت سے اور تہذیب کے ساتھ۔ مگر حاجی نے اسے زبردستی کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور کہا۔ لو پیو۔

لاچی نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور پھر اس کے سر پر اُنڈیل کر بولی۔ سور کے بچے! حرامی!!

میر چندانی نے غصّے میں آ کے لاچی کے مُنہ پر ایک چانٹا رسید کیا۔ لاچی اک دم غصّے سے اُٹھی۔ اس نے میر چندانی کی گردن سے پکڑ کر نیچے گرا لیا۔ اور جب حاجی اس کی مدد کو اٹھا تو اس نے پینترا بدل کر اُسے بھی چت کر دیا۔ اور پھر دونوں کی چھاتی پر چڑھ کر دونوں کے سروں کو ایک ایک دوسرے سے طبلے کی طرح بجانے لگی۔

اور زور زور سے چلّانے لگی۔ تاک دھنا دھن تھبا

تاک دھنا دھن۔ تاک دھنا دھن

تاک .... تاک

میر چنداؔنی اور حاجی چیخنے لگے۔

تھوڑی دیر میں بھگدڑ مچ گئی۔ لاچی اور وارڈرن اور گاہک اور طبلچی اور سارنگی والے مہرسوں والے اور خوشبو دار عطر والے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے اور سب کے بیچ میں لاچی ایک جھلائی ہوئی شیرنی کی طرح وار کر رہی تھی۔ اس کو مار۔ اس کو پیٹ۔ اس کو گرا۔ اس کے بال کھسوٹ۔ اس کا منھ نوچ کر ایک وحشیانہ خوشی سے چیخ رہی تھی اور ناچ رہی تھی۔

تاک دھنا دھن تھیا۔

پولیس دھب دھب کرتی مختلف زینوں سے اندر آ گئی۔ انسپکٹر۔ سب انسپکٹر۔ حولدار اور سنتری چند منٹ کے بعد سکون ہو گیا۔ پولیس نے سب کو گرفتار کر لیا۔ وارڈرن نے سنتریوں کے کان میں بہت کھسر پھسر کی۔ مگر ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

حوالدار بولا۔ جو کہنا ہے چوکی پہ چل کر کہو۔

جب سب لوگ حوالات میں بند کر دیئے گئے تو ایک وارڈرن نے کہہ سن کر اسسٹنٹ جیلر کالی چرن کو فون پر بلایا۔ کالی چرن پسینے میں تر بتر دوڑا ہوا آیا۔ اس کے منھ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اگر معاملہ پولیس نے نہ دبا دیا تو وہ برخاست تو کیا ہو گا۔ شاید اسے جیل بھی ہو جائے۔

انسپکٹر اور ڈپٹی جیلر منھ جوڑ کر بیٹھے۔ اور کالی چرن نے حاجی اور میر چندانی سے ملاقات کی۔ پھر ہاتھ ایک جیب سے دوسری جیب میں گئے۔ دوسری جیب سے تیسری جیب۔ جب جا کے کہیں گلو خلاصی ہوئی۔ اور کیسے نہ ہوتی میر چندانی اور حاجی کو معلوم تھا کہ اس دنیا میں جیب کی طاقت سے بڑی طاقت کوئی اور نہیں ہے۔ جب صبح پانچ بجے سے پہلے پہلے تفریح بازوں کی یہ ٹولی پھر جیل کے اندر پہنچ گئی۔ تب جا کے کالی چرن کو اطمینان ہوا۔ بال بال بچے ورنہ آج نوکری ختم تھی۔

چودھواں باب

اگر کالی چرن کا بس چلتا تو اس واقعے کے بعد لاچی کو جیل کے اندر ہی کڑی سے کڑی سزا دیتا۔ کیوں کہ لاچی کی ہٹ سے یہ سارا فساد کھڑا ہوا تھا۔ اگر عین موقعے پر پولیس انسپکٹر اپنے افسر بھائی کی مدد کرنے پر راضی نہ ہو جاتا تو دوسرے ہی روز شور مچانے والے اخبار اور بات کا بتنگڑ بنانے والے اخبار نویس یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوتے کہ آج جیل کے قیدی پولیس کی حوالات میں کیسے پلائے گئے۔ اسے لاچی پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ کمینی خانہ بدوش دو ٹکے کی چھوکری جلنے لیے آپ کو کیا سمجھتی ہے اس کا جی چاہتا تھا کہ ٹکٹی پر بندھوا کر لاچی کی پیٹھ پر بید لگائے۔ اور عالم خیال میں اس نے ایسا ہی کر لیا۔ اور وقتی طور پر اس کی مسرت سے اس نے لطف بھی اٹھایا۔ مگر جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے۔ حقیقت یہی تھی کہ لاچی کی تصویر خوب چند بنا رہا تھا۔ اس لئے لاچی کی رسائی سپرنٹنڈنٹ جیل تک تھی اور یہ بات بالکل صاف تھی کہ بید زنی تو کجا وہ ذرا سی بدسلوکی پر سپرنٹنڈنٹ جیل سے سارا واقعہ کھول کر بیان کر دے گی اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہی سوچ کر کالی چرن چپ رہا۔ اور اس نے لاچی سے کسی طرح کی بازپرس نہیں کی۔ جیناں بائی نے لاچی کو ضرور اتنا سمجھا دیا کہ وہ واقعہ کا خوب چند یا کسی سے کل ذکر نہ کرے۔ ورنہ مجھے سخت سزا دی جائے گی۔ بڈھی جیناں بائی کی خاطر لاچی نے خاموش رہنا منظور کر لیا۔ البتہ اس واقعے کے بعد دل آرا اور لاچی کی کٹی ہو گئی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے

سے بولنے کے لئے تیار نہ تھیں ۔ اس میں کسی ذاتی دشمنی کو دخل نہ تھا ۔ ان دونوں عورتوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہ تھا ۔ دونوں کو ایک دوسرے سے کسی طرح کا حسد بھی نہ تھا ۔ یہ لڑائی خیالات کی لڑائی تھی ۔ دل آرا کا خیال تھا کہ لاچی ضرورت سے زیادہ اپنی عصمت کی اہمیت جتاتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اس کا تعلق عورت کی روح اور اس کی پوری شخصیت سے ہے ۔ یہ غلط ہے ۔ یہ عورت کی عصمت تو عورت کے ہاتھ میں ایک طرح کا ہتھیار ہے جو اسے اپنی زندگی اور آسائش کے لئے مناسب موقعوں پر مناسب طریقے سے استعمال کرنا چاہئے اور اس میں کسی قسم کی جذباتیت کا دخل نہیں ہونا چاہئے ۔ جانے لاچی کے دل میں کیا خیال تھے وہ پڑھی لکھی تو تھی نہیں کہ دل آرا کی طرح اپنے دل کی بات انداز بیان کے پردوں میں چھپا کر بیان کر سکتی ۔ بس اسے ایک ضد تھی ۔ ایک جنون تھا جو اس کے سر پر سوار تھا ۔ وہ تو صرف یہ کہتی تھی ۔

میں نہیں بکوں گی ۔ کسی قیمت پر نہیں بکوں گی ۔

ارے یہ جو دل آرا ہے ۔ جو دیکھنے میں اتنی خوب صورت دکھائی دیتی ہے ۔ بڑی آوارہ اور بد قماش عورت ہے ۔ میں اسے کبھی منہ نہ لگاؤں گی ۔ اگر آپ اسے کسی عقیدے کا نام دے سکتے ہیں تو یہی لاچی کا عقیدہ تھا ۔ مگر اس دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے ۔ کیوں کہ یہ ایک سلجھی ہوئی معقولیت پسند دنیا ہے جس میں آپ اور ہم رہتے ہیں ۔ اس دنیا میں جب کوئی لاچی جیسی گمراہ روح آجاتی ہے تو ہم میں سے ہر ایک کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسے راہ راست پر لایا جائے ۔ اپنے بھلے کے لئے نہیں ۔ صرف اس کی اپنی بھلائی کے لئے ۔ اس قسم کے غلط احمقانہ غیر متوازن عقیدے کو اپنے دل میں جگہ دے کر کوئی عورت ایک دن بھی اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی ۔

یہی سوچ کر جیناں بائی اور جیل کی دوسری عورتوں نے لاچی کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ۔ اور مسلسل ڈیڑھ دو سال تک وہ اپنی کوششوں میں لگی رہیں ۔ حاجی عبدالسلام اور میر چندانی نے بھی اس کار خیر میں روپے پیسے سے ان کی مدد کی ۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ حاجی عبدالسلام اور میر چندانی دونوں نے اس رات کے خوفناک واقعے کے بعد یہ تہیہ کر لیا تھا کہ جس طرح ہو سکے لاچی کا

غرور توڑ دینا چاہیئے اور اس کی شخصیت کو اور اس کے ذاتی حسن وجمال کے وقار کو کچل کر ایسا ہموار کر دینا چاہیئے جیسے کولتار کی سڑک ہوتی ہے۔ اس کام کے لئے حاجی اور میر چندانی نے جیناں بائی کو ٹھیکہ دیا۔ کیوں کہ مہذب و متمدن دُنیا میں آج کل ہر کام ٹھیکے پر دیا جاتا ہے۔ دونوں بینکروں نے اس کام کے لئے پچاس ہزار روپیہ منظور کیا۔ وہ لوگ جو دل آزار کے لئے پندرہ بیس ہزار روپیہ خرچ کرنا اپنی تاجرانہ جبلت و ذہنیت کے خلاف سمجھتے تھے اب تاؤ کھا کر پچاس ہزار تک دینے کو تیار ہو گئے۔ ان لوگوں کا غصہ بھی روپے کی صُورت میں نکلتا ہے۔ یہ لوگ اگر دھرم اور ایمان پر آجائیں تو مندر اور مسجد بنانے کے لئے ہزاروں خرچ کر دیں۔ انتقام پر آجائیں تو ہزاروں خرچ کر کے مجھے اور آپ کو مروا ڈالیں۔ محبت کرنے پر آجائیں تو اپنی محبوبہ کو اشرفیوں میں تول دیں۔ اور سونے سے لاد دیں۔ ایک غریب آدمی اُن کے مقابلے میں محبت کرنے کی جراُت کہاں کر سکتا ہے۔ اور پھر لاچی ایسی ہے یا، وہ مدد گار عورت کب تک سونے کی سڑک پر چلنے سے انکار کرے گی۔ یہ بھی دیکھنا ہے۔

اس لئے بہت سوچ سمجھ کر یہ پراجیکٹ منظور کیا گیا۔ "لاچی پراجیکٹ" اس کا تخمینہ پاس ہوا۔ ٹھیکہ دے دیا گیا۔ اور مزدور کام پر لگا دیئے گئے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات!

میں نہیں بکوں گی۔ مر جاؤں گی مگر نہیں بکوں گی۔

یہی لاچی کا آخری فیصلہ تھا۔

جیناں نے سمجھایا۔

پچاس ہزار کی رقم کوئی کم نہیں ہوتی آج کل کے زمانہ میں۔ احمق نہ بنو۔ آخر قبول کر لو۔ اپنی زندگی بنا لو۔

اور گُل سے دھوکہ کروں۔

گُل کو پتہ بھی نہ چلے گا۔

کیا دھوکا اسی کو کہتے ہیں جس کا پتہ چلے۔ اور تمھارا کیا خیال ہے؟

مجھے پتہ بھی نہیں چلے گا۔ میں نے کس سے دھوکہ کیا ہے۔

اس میں دھوکے کی بات کیا ہے۔ یہ تو ایک وقتی بات ہوگئی۔ صرف اس جیل کی چہار دیواری تک محدود رہے گی۔ جب تم اپنی سزا بھگت کے جیل سے باہر نکلوگی تو اس پچاس ہزار کے سہارے ایک نئی زندگی شروع کر سکوگی۔

گُل سے کیا کہوں گی۔ یہ روپیہ میں نے کہاں سے حاصل کیا ہے۔

چاہو تو کہہ دینا کہ میرے نام لاٹری نکلی ہے۔ چاہو تو سچ سچ بتا دینا۔ پھر دیکھ لینا۔ گُل کی آنکھیں تمھارے بے غرض محبوب کی آنکھیں بھی ان روپوں کو دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ اور وہ تمھاری زبان سے تمھاری بے وفائی کی داستان سُن کر بھی تم سے سمجھوتہ کرے گا۔

نہیں وہ ایسا نہیں کرے گا۔

شرط ہو جائے۔

نہیں میں شرط لگانے کے لئے بھی تیار نہیں ہُوں۔ یہ بات نہیں ہے مجھے گُل پر بھروسہ نہیں ہے۔ وہ تو ہے۔ اور کبھی نہیں بدلے گا۔ میرا گُل.... وہ بھی میں جانتی ہوں۔ لیکن کیوں ایک شرط کی خاطر ایسی غلط بات کروں۔

اس میں غلط بات کیا ہے۔ تم اپنے جسم کی مالک ہو۔ یہ جسم تمھارا ہے کسی دوسرے کا تو ہے نہیں۔ اور محبت تو بے کار سا خیال ہے۔ آنی جانی بات ہے۔ زندگی میں دس بار محبت ہوتی ہے۔ بیس بار ٹوٹ جاتی ہے۔ چالیس بار پھر ہو جاتی ہے۔ خود میں نے اپنی جوانی میں جانے کتنی محبتیں کر ڈالیں۔ جب پہلی محبت ذرا پُرانی اور بوسیدہ ہونے لگی میں اس محبت کا دروازہ بند کر کے نئی محبت کا دروازہ کھول دیا۔

واہ! لاچی بڑے غصّے سے بولی۔ عورت کی محبت نہ ہوئی میونسپلٹی کی ٹونٹی ہوگئی۔ جب جی چاہا ٹونٹی گھما کے پانی پی لیا۔ جب جی چاہا گھما کے بند کر دیا۔

بیناں بائی لاجواب ہو کے چلی گئی۔

پلٹ پلٹ کر طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے اس نے ہزار بار اس نے بات کو

مختلف پیرایوں سے لاچی کے سامنے پیش کیا۔ مگر لاچی کا ایک ہی جواب تھا۔ اس میں اس کی ضد کو دخل نہ تھا۔ لاچی کا جواب گویا اس کے جسم اور روح کی پوری شخصیت کا جواب تھا۔ وہ کوئی دوسرا جواب دے نہ سکتی تھی۔ کبھی کبھی وہ عقلی اعتبار سے لاجواب ہو جاتی۔ قائل بھی ہو جاتی۔ مگر دوسرے لمحے میں غم و غصّے۔ احتجاج اور نفرت کا ایک بڑا سا لاوے کی طرح اُبلتا ہوا اس کے رگ و ریشے میں سما جاتا اور وہ غصّے سے پاؤں پٹک کر کہتی۔

نہیں نہیں جو میری مرضی کے خلاف چھوئے گا۔ میں اسے کچّا چبا جاؤں گی۔

کچّا تو خیر وہ کیا چباتی۔ جیل میں ایک سے ایک بڑا گھاگ رہتا تھا۔ جو لاچی کی گردن پر چھری رکھ کر اس کا غرور توڑ سکتا تھا۔ مگر کرم بخت خوب چند کی وجہ سے سب اس سے ڈرتے تھے۔ اس کے ہوتے ہوئے لاچی کو کسی بھی جال میں نہیں پھنسایا جا سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ جو ہو سکتا تھا وہ کیا جا رہا تھا۔

لاچی کو جیل میں عجیب عجیب تجربے ہو رہے تھے۔ ایک روز اس کی ملاقات گنگا بائی سے ہوئی۔ جوان اور خوب صورت لڑکی تھی۔ کم بخت کی بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی اس پر دو درجن چوریوں کا الزام ہے۔

کیا تم مُرغیاں چُراتی تھیں۔ لاچی نے اس سے پُوچھا۔

گنگا کے مُنھ سے ہنسی کا فوارہ اُبل کر بکھر گیا۔ اس کی چاندی جیسی ہنسی کی لہریں دور دور تک فضا میں پھیل گئیں۔

بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

نہیں میں کپڑے چُراتی تھی۔

کیسے۔

میرے ساتھ دو مرد بھی کام کرتے تھے۔ ہم تینوں کی ایک ٹولی تھی۔ ہم لوگ آدھی رات کے وقت بڑی بڑی دکانوں کے شوکیس کے کانچ بڑی احتیاط سے توڑ ڈالتے تھے۔ پھر اُن

میں گھس کر چوری کرتے ۔ وہ دونوں مرد باہر رہتے ۔ میں اندر جاکر پلاسٹک کے ماڈلوں کے جسم سے ساڑیاں اُتار لیتی اور دوسرے تھان بھی جو شوکیس میں سجے ہوتے نکال نکال کر باہر پھینکتی ۔

اگر کوئی پولیس والا آجاتا ۔ تو وہ دونوں مرد اِدھر اُدھر بھاگ جاتے اور میں شوکیس میں کھڑی ہوکر بالکل ایک ماڈل کی طرح بن جاتی اور پولیس والے بھی ایک پلاسٹک کا ماڈل سمجھ کر آگے چلے جاتے تھے ۔

اب کے لاچی خوب ہنسی ۔

اُسے یہ ترکیب بہت پسند آئی ۔

بہت عمدہ ۔ بہت اچھی ترکیب ہے بہت کم کسی کو سوجھی ہوگی ۔

ہاں مگر پولیس والوں نے آخر ہمیں بھی پکڑ ہی لیا ۔

تم جیل سے باہر جاکر کیا کروگی ۔

پھر وہی کام شروع کروں گی ۔

پھر سزا پانے کا فائدہ کیا ہوا ۔

سزا مجرم کے لئے ایک وقفہ ہے ۔ گنگا نے سوچتے ہوئے کہا ۔

پھر بولی ۔ اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے ۔

تم نے شادی نہیں کی ۔ لاچی نے پُوچھا ۔

جن دو مردوں کے ساتھ میں کام کرتی ہوں ان دونوں کے ساتھ میں نے تقریباً شادی کر رکھی ہے ۔

دونوں کے ساتھ ۔ لاچی حیرت سے بولی ۔

ہاں دونوں کے ساتھ گنگا نے کسی قدر افسردگی کے ساتھ کہا ۔

تھوڑی دیر وہ سوچتی رہی ۔ پھر بولی ۔ اور اب اس کا چہرہ پھر بشاش ہوگیا ۔ مگر وہ دونوں مجھے بہت خوش رکھتے ہیں ۔

لاچی کے دل میں ایک لمحہ کے لئے خیال آیا کہ جیل سے نکل کر کچھ عرصے کے لئے اس پیشے کو اختیار کرے ۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے دل میں اس طرح کی چوری کی خواہش بھی پیدا ہوئی اس طرح کا خطرہ مول لینا اسے بہت پسند آیا مگر دو مردوں والی بات اسے پسند نہ آئی۔ آخر اب وہ مردوں کے ساتھ برابر ان کے خطرے کی حصہ دار ہوتی ہے برابر کام کرتی ہے تو اس پہ یہ توقع کیوں کی جاتی ہے کہ چوری کے علاوہ وہ اپنا سب کچھ ان کے حوالے کر دے ۔ یہ تو دھاندلی ہے ۔ برابر کی سلجھے داری نہیں ہے ۔

لاچی کو شلیا بھی بہت عجیب معلوم ہوئی ۔ کوشلیا کے لئے نام تھے ۔ اقبال بانو ۔ میری ڈی سوزا ۔ سرجیت کور اور رجا نے کیا اُلا بلا ۔ وہ گریجویٹ لڑکی تھی ۔ انگریزی کے علاوہ اُردو ۔ ہندی پنجابی مراٹھی ۔ بنگالی ۔ فرنچ ۔ تامل اور ملیانم زبانوں میں شُدبُد رکھتی تھی ۔ بڑی اپ ٹوڈیٹ اور فیشن ایبل لڑکی تھی ۔ گرفتار ہونے سے پہلے اس کا دھندا یہ تھا کہ وہ بیکار نوجوانوں کو نوکری کا لالچ دے کر اور مختلف منسٹروں اور آفیسروں سے اپنا رسوخ ظاہر کرکے ان سے روپیہ اینٹھتی تھی اور روپیہ لے کر رفو چکر ہو جاتی تھی ۔ آج تک وہ دو تین سو نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دھوکا دے کر اس طرح ان سے ہزاروں روپیہ حاصل کر چکی تھی ۔

لاچی نے پُوچھا ۔ مگر تُم تو پڑھی لکھی لڑکی ہو ۔ کہیں بھی ملازمت کر کے دو تین سو روپے با عزت طریقے سے کما سکتی ہو ۔ دو تین سو روپے میں میرا خرچ پُورا نہیں ہوتا ۔

تو خرچ کم کر دو ۔

خرچ کم نہیں ہو سکتا ۔ میں اچھی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں ۔

اچھی زندگی کیا ہوتی ہے ۔

اچھی زندگی اچھے زیوروں اور بہت سے روپے سے حاصل ہو سکتی ہے ۔

روپیہ ! روپیہ !! روپیہ کیا دُنیا میں خوشی صرف روپے سے حاصل کی جا سکتی ہے ۔

خوشی تو اس دُنیا میں عورت کو کہاں ملتی ہے ۔

کوشلیا غصّے سے بولی۔ میرے ماں باپ نے دولت کے لالچ میں آکر مجھے ایک بُڈھے کے گلے باندھ دیا۔ جب وہ بُڈھا مر گیا تو اس کی پہلی بیوی اور بچّوں نے مجھے گھر سے نکال باہر کیا۔ جب اپنوں نے مجھ سے دھوکا کیا تو میں غیروں سے دھوکر کرکے کون سا اتنا بڑا پاپ کر رہی ہوں۔ میں نے لاکھ چاہا کہ کوئی شریف آدمی مجھ سے شادی کرے۔ تاکہ میں مذہبی اور قانونی اعتبار سے خود کو اس کے ہاتھ بیچ کر آرام وسکون کی زندگی گزاروں۔ مگر کوئی شریف آدمی مجھ سے شادی کرنے کے لیۓ تیار نہ ہوا۔

تو گویا تم شادی میں بھی بیچنے کی بات کرتی ہو۔

شادی میں بھی عورت ایک طرح اپنا جسم بیچتی ہے اور کیا کرتی ہے۔

محبت کوئی چیز نہیں۔

ہوتی ہوگی۔ کوشلیا بڑی تلخی سے بولی۔ مجھے تو نہیں ملی۔

لاچی نے سوچ سوچ کر کہا۔ میں تو سمجھتی ہوں تم اتنی اچھی ہو کہ ہر شریف آدمی تم سے شادی کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ اگر تم اسے اپنی فریب کاری کی باتیں نہ بتاؤ۔

میں جس شریف آدمی سے شادی کا خیال کروں اسے کیسے نہ بتاؤں۔ اسے تو سب کچھ بتانا ہی پڑے گا میں ہر بار جیل سے چھوٹ کر تہیہ کرتی ہوں کہ اب سیدھے راستے چل کر کسی شریف آدمی سے شادی کرلوں گی۔ اور جب کسی شریف آدمی کو اپنی کہانی سُناتی ہوں تو وہ بدک جاتا ہے۔

شریف آدمی سے تمھارا کیا مطلب ہے۔ لاچی نے حیرت سے پُوچھا۔

ایسا آدمی جس کی آمدنی کم ازکم ایک ہزار روپیہ ماہانہ ہو۔

ارے۔ بے اختیار لاچی کے مُنھ سے نکلا۔ تب تو واقعی کوئی تمھاری مدد نہیں کرسکتا۔

کوشلیا عرف اقبال بانو عرف سرجیت کور نے اپنے بریدہ گیسوؤں کو ایک ادائے خاص سے جھٹکا دیا جیسے اسے دُنیا میں کسی کی پرواہ نہیں۔ پھر اس نے مردوں کو ایک موٹی سی غلیظ گالی دی اور لاچی سے مُنھ موڑ کر اپنی بارک کی طرف چل دی۔

اس دن لاچی کے خیالات میں عجیب اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ جب وہ اپنا گھاگرا پہنے ہاتھ پر دف اٹھائے خوب چند کے سامنے اسٹول پر کھڑی ہوگئی تو آج اس کے چہرے پر وہ روز کی سی بشاشت نہیں تھی۔ آج اس کا چہرہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ خوب چند تصویر بنانے میں منہمک تھا۔ یکایک لاچی بولی۔ مسٹر شان۔

ہاں لاچی۔

اگر روپے سے خوشی حاصل ہوتی ہے تو ایک روپے سے بھی ہوسکتی ہے اور ایک ہزار سے بھی۔

ہاں لاچی۔

لاچی تھوڑی دیر چپ رہی۔ پھر بولی۔ مسٹر شان۔

ہاں لاچی۔

کیا تم شریف آدمی ہو۔

کیا مطلب۔

یعنی تمھاری تنخواہ کتنی ہے۔

چھ سو روپے ہے۔

تب تم شریف آدمی نہیں ہو۔

خوب چند کا قلم رک گیا۔ وہ لاچی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ایسا کیوں سوچتی ہو تم۔ میں نے تم سے کبھی کوئی گستاخی کی۔

نہیں۔ مگر کوشلیا کہتی ہے کہ شریف آدمی وہ ہوتا ہے جس کی تنخواہ کم از کم ایک ہزار روپیہ ہو۔

خوب چند ہنسا بولا۔

جو بات کوشلیا کہتی ہے وہی بات دُنیا بھی کہتی ہے۔ اور اس لئے اس دُنیا میں فریب کاری ہوتی ہے۔

لاچی سوچ سوچ کر پھر بولی۔

سُپری ٹان۔

ہاں لاچی۔

تو کیا جو آدمی ایک ہزار کماتا ہے وہ دھوکہ نہیں کرتا۔

نہیں کرتا تو ہے۔ بلکہ ایک ہزار پانے والا اور زیادہ دھوکہ کرتا ہے۔

پھر شرافت کیا ہوتی ہے۔

تم نے بہت مشکل سوال پُوچھا ہے لاچی۔ خوب چند نے لاچی کے قریب جاکر کہا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک خط نکال کر کہا۔

تمھارے سوال کا جواب اس خط میں ہے۔

یہ خط گُل کا ہے۔ لاچی زور سے چلائی۔

ہاں۔

لاچی چھلانگ مار کر اسٹول سے نیچے آگئی۔ وہ خط لینے کے لئے بچّوں کی طرح بے قرار ہوکر خوب چند کے پاس دوڑی۔ خوب چند بچّوں کی طرح اس سے دُور بھاگنے لگا۔ آخر لاچی نے اسے پکڑ لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر اس سے خط چھین لیا۔ پھر اس نے خوب چند کو دونوں بازوؤں میں اُٹھا کر اسٹول پہ بٹھا دیا۔ جس پر وہ بیٹھی تھی۔ اور وہ خود ایزل کے پاس جا کھڑی ہوگئی۔ اور بُرش اُٹھا کر اس نے تہدیدی انداز سے اسے جُھلاتے ہوئے کہا۔

ابھی گُل کا خط مجھے سُناؤ۔ ورنہ میں اس برش سے تمھارے سارے رنگوں پہ پانی پھیر دوں گی۔

ارے رے۔ ایسا مت کرنا۔ میں تمھیں ابھی خط سُناتا ہوں۔

خوب چند نے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ اور خط سُنانے لگا۔ لاچی دوڑ کر اس کے قدموں میں آکر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹھوڑی خوب چند کے گھٹنے پر رکھ لی اور خط سُننے لگی۔

خوب چند بولا۔

جان سے پیاری لاچی۔

لاچی نے خوب چند کو مارنے کے لئے ایک دم ہاتھ اُٹھایا۔

خوب چند نے اس کا وار روکتے ہوئے کہا۔

ارے پگلی! یہ میں تھوڑی کہہ رہا ہوں۔ یہ تو گُل کا خط تمھیں پڑھ کر سُنا رہا ہوں۔

اچھا تو ٹھیک ہے۔ مگر دیکھو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سُنانا۔ اپنی طرف سے کچھ جوڑنا نہیں۔ ورنہ .....

خوب چند سُنانے لگا۔

میرے دل میں ہردم تمھارا تصور رہتا ہے۔ ہر وقت تمھاری تصویر میری آنکھوں میں سمائی رہتی ہے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب اپنی لاچی کی پیاری پیاری صورت مجھے یاد نہ آتی ہو۔ اوّل سے آخر تک۔ زندگی سے موت تک جب تک زندہ ہوں اپنی لاچی سے محبت کرتا رہونگا۔

لاچی آنکھیں بند کر کے سُنتی گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ معمولی لفظ نہیں ہیں۔ شہد کے گھونٹ جو اس کی روح میں اُترتے جارہے ہیں۔ نرم۔ ملائم۔ ریشم کے شہپر پر ہیں جن کے سہارے وہ کائنات کے خلاؤں میں اڑی جارہی ہے۔

گُل ..... گُل ..... گُل ..... میرے پھول .....

پندرھواں باب

دوسرے ماہ گُل لاچی سے ملنے کے لئے آیا۔

لاچی گُل کا ہاتھ پکڑ کر خوب چند کے پرائیویٹ کمرے میں لے گئی۔ اور بڑے فخر سے اُسے خوب چند کو دکھا کے بولی۔

یہ میرا گُل ہے۔

خوب چند نے گُل کو سر سے پاؤں تک یعنی چپل سے پشاوری کلاہ تک دیکھا۔ لانبا بانکا۔ وجیہہ۔ چھریرا گُل۔ مردانہ وقار اور حُسن کی زندہ تصویر۔ خوب چند نے ایک لمحہ کے لئے دل ہی دل میں اپنا اس سے مقابلہ کیا۔ پھر اس کے چہرے پر ایک پھیکی کھسیانی سی روتی ہوئی مُسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اس نے گُل سے کہا۔ آؤ آؤ۔ یہاں بیٹھو۔

لاچی بولی۔ اور یہ میرا سیٹھ خان ہے.....

بہت اچھا آدمی ہے۔ اس کی مہربانی سے ہم لوگ یہاں مل رہے ہیں۔ ورنہ لوہے کی جالی والے کمرے میں ملتے۔

گُل نے تشکر آمیز نگاہوں سے خوب چند کی طرف دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کے ہاتھوں کی بے چینی البتہ رہی تھی کہ گُل بے حد مضطرب ہے۔

خوب چند نے جب گُل کی خاموشی دیکھی اور اس کی انگلیوں کا اضطراب تو اس نے بُرش

کو آہستہ سے پانی کے چھوٹے سے پیالے میں دھیرے دھیرے دھویا۔ پھر آنکھیں جھکائے آہستہ سے کمرے سے باہر ہو گیا۔

خوب چند کے جانے کے بعد لاچی بے اختیار ہو کر گُل سے لپٹ گئی۔ اس نے اس کا وہ پشاوری کلاہ جس پر لُنگی بندھی ہوئی تھی اُتار کر الگ رکھ دیا۔ اور اس کے چہرے کو پہلے اپنے ہاتھوں میں لے کر پھر اسے اپنے گالوں سے لگا کر گلوگیر آواز میں بولی۔

گُل۔ گُل تم پچھلے ماہ مجھ سے ملنے کے لئے نہیں آئے۔ کیوں

گُل چُپ رہا۔ وہ اپنے بے چین ہاتھوں کو کبھی کھولتا کبھی بند کرتا۔ اس کے سینے سے لگی لاچی اس کے دل کی دھڑکن سُن رہی تھی۔ ہولے ہولے گُل کا ہاتھ لاچی کی کمر پر گیا اس نے اک دم اسے بھینچ کر اپنے گلے سے لگا لیا پھر ایک دم چھوڑ دیا۔ اور سر جھکا کر لاچی سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔

گُل کیا بات ہے۔ لاچی اک دم گُل کے قریب آگئی۔ اور گُل کا مُنھ اپنی طرف پھیرتے ہوئے بولی۔ کیا بات ہے۔ بتاؤ گے نہیں۔

گُل نے آہستہ سے کہا۔ میری درخواست نامنظور ہو گئی ہے۔

کون سی درخواست۔

ہندوستان کا شہری بننے کی درخواست۔

لاچی یکایک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

نامنظور ہو گئی تو کیا ہوا۔ اس میں اتنا مُنھ لٹکا کر بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم خانہ بدوشوں کو دیکھو۔ ہم تو کہیں کے شہری نہیں ہوتے۔ جہاں جی چاہتا ہے چلے جاتے ہیں

تمھاری بات اور ہے۔ میں پٹھان ہوں۔ پاکستان کے مُلک کا رہنے والا ہوں۔

مُلک کیا ہوتا ہے۔ لاچی نے پُوچھا۔

مُلک۔ گُل بولتے بولتے رُک گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس نے بھی اپنے آپ سے پوچھا .... واقعی مُلک کیا ہوتا ہے اور جب اسے اس کا کوئی معقول جواب نہ سُوجھا تو اس نے

رُکتے رُکتے کہا ملک تو ملک ہوتا ہے۔ جیسے ایک ملک پاکستان ہے ایک ملک ہندوستان ہے ایک ملک چین ہے۔ ایک ملک جاپان ہے۔ یہ سب ملک ساری دھرتی کے الگ الگ حصّے ہیں۔ مگر ہم خانہ بدوشوں کے لئے تو یہ ساری دھرتی ایک ہے۔

مگر اس دُنیا کے انسانوں کے لئے ایک نہیں ہے۔ گل نے ذرا تلخی سے کہا۔ انھوں نے جو اپنے آپ کو انسان۔ مہذب اور ترقی یافتہ کہتے ہیں اس دھرتی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ اور مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ یہ تیرا۔ وہ میرا۔ وہ اس کا۔

لیکن تم میرے ہو۔ لاچی نے اپنے دونوں بازوؤں سے گل کے گرد بڑی محبت سے گھیرا ڈالتے ہوئے کہا۔ تم صرف میرے ہو۔ مجھے کسی کے ملک سے کیا لینا دینا ہے۔ میں تو ایک غریب خانہ بدوش لڑکی ہوں۔ مجھے ان بڑی بڑی باتوں کی سمجھ نہیں ہے۔ اگر تمھاری درخواست انھوں نے نامنظور کر دی ہے تو کیا ہوا۔ اللہ میاں نے ہم دونوں کی محبت کی درخواست تو نامنظور نہیں کی۔

اب تمھیں کیسے بتاؤں لاچی۔ گل نے حد مضطرب ہو کر کہا۔ اس درخواست کے نامنظور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میں ہندوستان میں نہیں رہ سکوں گا۔ تم سے ہر ماہ ملنے کے لئے نہیں آیا کروں گا۔ جب تم قید و بند کی سختیاں جھیل کر اس جیل خانے سے باہر نکلو گی تو میری صورت نہ دیکھ سکو گی۔

نہیں نہیں تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم مجھے پریشان کرنے کے لئے یہ سب کچھ کہہ رہے ہو تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔ کہہ دو نا گل یہ سب کچھ مذاق ہے۔

گل سر جھکائے چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ بہت دیر کے بعد جب اس نے سر اٹھایا تو لاچی نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

ہم لوگ سود خور پٹھان تھے۔ برسوں سے اس ملک میں یہی دھندا کرتے تھے جب کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ میرے باپ نے کبھی ہندوستان کا شہری بننے کے لئے نہیں سوچا۔ نہ میں نے۔ ہم لوگ سال دو سال بعد اپنے وطن جاتے تھے۔ اور وہاں چند ماہ رہ کر پھر واپس آ جاتے

تھے۔ ہمارا روزگار یہاں تھا۔ وطن دوسرا تھا۔ مگر اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ پہلے یہ ایک مُلک تھا۔ اب اس کے دو ملک ہو گئے ہیں۔ اب پاکستان ایک الگ اور آزاد مُلک ہے ہندوستان دوسرا ملک ہے۔ الگ اور اپنی جگہ آزاد۔ قانون بھی بدل گئے ہیں۔ سود خوری پر پابندیاں لگائی جا چکی ہیں۔ میرے باپ کا دھندا مندے میں چلا گیا ہے وہ تو پاکستان جا رہا ہے۔ اس نے تو کبھی ہندوستان کا شہری بننے کے لئے نہیں سوچا۔ میں نے بھی اس سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ مگر پہلے تم نہ تھیں اس لئے میں کیوں ایسا سوچتا اب میرے دل میں تمھاری محبت آئی تو میں نے یہاں رہنے کا سوچا۔ میں نے ہندوستان کا شہری بننے کی درخواست دی۔ مگر یوں سوچا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ان لوگوں نے میری درخواست نامنظور کر دی۔ اب وہ مجھے یہاں رہنے نہ دیں گے۔

تم نے ان سے کہا ہوتا۔ میری لاچی یہاں ہے میں یہاں سے کیسے جا سکتا ہوں۔

وہ لوگ محبت کو نہیں سمجھتے۔ وہ صرف نفرت کو سمجھتے ہیں۔

تم نے کہا ہوتا۔ یہ ساری دھرتی خدا کی ہے۔

یوں تو اس دُنیا میں مندر مسجد اور گرجا بہت سے ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو زمین کا ایک چپہ خدا کا نہیں ہے۔

میں تمھیں نہیں جانے دوں گی۔ میں تمھیں نہیں جانے دوں گی۔ لاچی یکایک بڑی تیزی سے بولی۔ مگر اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے بازوؤں سے ہٹا لئے۔ اور اپنے چہرے کو ان میں چھپا لیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

کیوں روتی ہے لاچی جانے کب سے آج سے نہیں شاید سینکڑوں۔ ہزاروں سال سے۔ روز ازل سے۔ تخلیق آدم سے انسانیت اسی طرح رو رہی ہے اور محبت اس طرح بین کر رہی ہے۔ نام تو بہت لیتے ہیں لوگ انسانیت کا محبت کا اور خوب صورتی کا اور بھائی چارے کا۔ حُسن کا اور پاکیزگی کا سیاست دانوں نے ان قدروں کے ڈھنڈ والے پیٹ پیٹ کر ادیبوں نے کتابیں لکھ لکھ کر فلاسفروں نے زندگیاں اسی سوچ میں گھلا کر انسانیت کو سہارا دیا ہے۔ کس نے پاکیزگی کی

عزت کی ہے۔ کس نے حُسن کو مشاطگی بخشی ہے ۔ یہ لوگ محبت کی آڑ میں نفرت انسانیت کے رُوپ میں درندگی۔ خوب صُورتی کے پردے میں بدصورتی اور پاکیزگی کے جھروکے میں گندگی پھیلا پھیلا کر اپنی بلند و بالا تہذیب کا جھنڈا اُونچا کرتے ہیں۔ تہذیب ان انسانوں سے زیادہ دریائی گھوڑوں میں پائی جاتی ہے۔

گُل نے آہستہ سے کہا۔ سات دن کے اندر اندر مجھے یہاں سے چلا جانا ہوگا۔

لاچی پھُوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

گُل نے لاچی کے آنسو پونچھے۔ اس نے صرف اپنے آنسو ہاتھ کی پُشت سے جھٹک دیئے۔ اس کا نچلا جبڑا تن گیا۔ اس نے بڑی سختی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کیں اور کھڑا ہو گیا۔

لاچی نے اس کے بازو پکڑ لئے۔ مت جاؤ میرے گُل۔ مت جاؤ۔ کہیں مت جاؤ۔

گُل نے بڑی مشکل سے ایک قدم اٹھایا۔ اور دوسرا قدم تیسرا قدم لاچی اس کے پاؤں کے ساتھ روتی اور گھسٹتی چلی آئی۔

مت جاؤ میرے گُل۔ مت جاؤ۔ لاچی رو رو کر بولی۔

آخری کوشش کر کے گُل نے لاچی کی گرفت سے اپنا پاؤں آزاد کر لیا اور دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ لاچی وہیں زمین پر پڑی روتی رہی۔

بہت دیر کے بعد خوب چند اندر آیا۔ اور اس نے لاچی کو زمین سے اُٹھایا۔ اس کے آنسو پونچھے۔ اور اس کا سر اپنے کندھے پر رکھا اور پُوچھا۔ گُل چلا گیا۔

ہاں۔ لاچی رُندھے ہوئے گلے سے بولی۔ اور اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ خوب چند اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

گُل نے تجھ سے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ مگر اس میں اس بے چارے کا کیا قصور ہے۔ قصور تو حالات کا ہے اور اس زمانے کا ہے۔ مگر تم فکر نہ کرو لاچی۔ گُل چلا گیا تو کیا ہوا میں جو

موجود ہوں ۔ میں تمھاری دیکھ بھال کروں گا۔ تمھیں جیل میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ اور جب تم جیل کاٹ کر آزاد ہو جاؤ گی تو میں اس جیل کی نوکری سے استعفیٰ دے دوں گا اور تم سے شادی کروں گا۔ اور تمھیں پیرس لے چلوں گا۔ اور دنیا کو وہ شاہکار دکھاؤں گا جو میری تصویر ہوگی ۔ اور دنیا کو وہ شاہکار بھی دکھا دوں گا جس کے حسن سے متاثر ہو کر میں نے اس کی تخلیق کی ہے۔

یکا یک لاچی نے اپنا جھکا ہوا سر خوب چند کے کندھے سے اٹھا لیا۔ اس کا ڈھیلا بدن ایک کمان کی طرح تن گیا۔ وہ خوب چند سے الگ ہو کے بیٹھ گئی ۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور شعلہ بار نگاہوں سے خوب چند کی طرف دیکھ کر بولی ۔

سپہری تان ۔

ہاں لاچی ۔

کیا تم مجھے کسی طرح عمر بھر کی قید نہیں دے سکتے ۔

نہیں لاچی جس کا جتنا جرم ہوتا ہے اسے اتنی ہی سزا ملتی ہے ۔

تو پھر مجھے کس طرح عمر قید ہو سکتی ہے ۔

اگر تم دوسری بار کسی انسان کو قتل کرو .... تو میں پھر جیل سے چھوٹ کر قتل کروں گی ۔ پھر قتل کروں گی اور اس وقت تک انسانوں کو قتل کرتی رہوں گی جب تک تم مجھے عمر قید کی سزا نہ دو ۔ یا پھانسی پر نہ چڑھا دو۔

تم ایسا کیوں سوچتی ہو لاچی ۔

اس لئے کہ تم سب قتل کر دینے کے لائق ہو ۔

پھر وہ وہاں سے اٹھی اور ایزل پر رکھی ہوئی اپنی نامکمل تصویر کی طرف بڑھی ہاتھ بڑھا کر اس نے تصویر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر دونوں ہاتھوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ۔

تم عورت کی تصویر بنانے کا کیا حق رکھتے ہو ۔ کبھی تم نے اس کے دل کے اندر جھانک کر دیکھا ہے ۔ تم سب لوگ اس کے ارد گرد لوہے کی سلاخیں کھڑی کرنا چاہتے ہو لیکن تم لاچی کو

نہیں جانتے ۔ میں ایک آزاد خانہ بدوش لڑکی ہوں ۔ میرے لئے کوئی ملک نہیں ہے ۔ کوئی قوم نہیں ہے اور کوئی مذہب نہیں ہے میں ہر دیوار پھلانگ جاؤں گی اور ہر سلاخ توڑ دوں گی ۔ میں چوری کروں گی ۔ جیب کتروں گی ۔ قتل کروں گی ۔ ڈاکے ڈالوں گی لیکن کبھی کوئی گل کے سوا میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا سکے گا ۔

لاچی نے گویا عرش کی بلندیوں سے زمین پر بیٹھے ہوئے حقیر خوب چند کو دیکھا ۔ اور پھر شاہانہ وقار سے قدم اٹھاتی ہوئی اس طرح دھیرے دھیرے کمرے سے نکلی ۔ جیسے اس نے انجیل کی آخری آیت آسمان سے زمین پر اتار دی ہو ۔ اور اپنا کام ختم کرکے تختہ دار کی طرف بڑھ رہی ہو ۔

اور خوب چند نے سوچا ۔

لاچی ! کیا کاغذی تصویر پھاڑ دینے سے ذہن کی تصویر بھی پھاڑی جا سکتی ہے ۔ بیوقوف دلربا ! تیری تصویر تو میں اب آنکھ بند کرکے بھی بنا سکتا ہوں مگر اس نے لاچی سے کچھ نہیں کہا ۔ خاموشی سے تصویر کے ٹکڑے ہوتے دیکھتا رہا ۔

سولہواں باب

خوب چند نے پھر بڑی محنت اور کاوش سے لاچی کی تصویر بنائی۔ جب تصویر مکمل ہو گئی تو لاچی نے اسے دیکھ کر کہا۔

یہ جھوٹی تصویر ہے۔

کیا جھوٹی ہے۔ خوب چند نے لاچی سے پوچھا۔

میں اتنی خوب صورت نہیں ہوں جتنی یہ تصویر ہے لاچی نے تصویر کی طرف دیکھ کر اعتراف کیا۔ یہ لباس میرا ہے یہ صورت بھی میری ہے۔ رنگت اور قد اور شکل سب بالکل ویسی ہی ہے۔ جیسی میں ہوں۔ تاہم میری تصویر ہوتے ہوئے بھی میری نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے میری ٹان۔ لاچی نے تصویر کی طرف سے مڑ کر خوب چند سے پوچھا۔

خوب چند کا رنگ فق ہو گیا۔ آخر وہ لمحہ آ پہنچا جس کا اس کو انتظار تھا۔ وہ کہے یا نہ کہے اس نے اس تصویر کے خدوخال ہولے ہولے ابھارتے ہوئے کئی بار سوچا تھا۔ کہہ ڈالے پھر سوچا تھا کیوں کہے۔ آخر خاموشی کی بھی تو ایک زبان ہوتی ہے اور نگاہ بھی گویا ہوتی ہے۔ اور کانپتی ہوئی انگلیوں کی پور پور سے یہ کیسا نغمہ پھوٹتا ہے کیا یہ کسی کو نہیں سنائی دیتا۔ میں نے تو تیری تصویر کے ذریعے تجھ سے بہت کچھ کہا ہے لاچی پھر تو ہنستی کیوں نہیں۔ کیا تو صرف اس میں اپنی شخصیت دیکھتی ہے۔ اپنی صورت کا عکس۔ اپنے حسن کے خدوخال۔ لیکن میری روح کا جال تجھ سے

کیوں پوشیدہ ہے۔ میرے ترسے ہوئے برش کے رنگ۔ انھوں نے تیری تصویر میں کتنی نادیدہ حسرتوں کے رنگ برنگے گلزار کھلا دیئے ہیں۔ اری تو کیسی لڑکی ہے۔ میرے دل کا لہو بھی نہیں دیکھ سکتی۔ اب میں تجھ سے کیا کہوں۔

خوب چند خاموش نگاہوں سے لاچی کی تصویر کی طرف دیکھتا رہا اور نہ بولا اس نے لاچی کے کسی سوال کا جواب نہ دیا۔ اس کے منھ سے ایک آہ تک نہ نکلی۔ اس کی آنکھوں میں ایک آنسو تک نہ آیا۔ بس وہ خاموشی سے مٹھیاں بھینچے سختی سے ہونٹ بند کئے تصویر کے سامنے چپ چاپ کھڑا رہا۔

لاچی اس کے پاس آگئی۔ اس نے خوب چند کے کندھے پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بہت مدھم اور میٹھی آواز میں بولی۔ اگر میں گل سے پیار نہ کرتی تو تیری ہو جاتی تپڑی مان۔

خوب چند یکایک چونکا۔ پھر اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں تن گئیں۔ اس کا سارا جسم طوفان میں لرزنے والے پتے کی طرح کانپا اور کانپ کر ساکت ہوگیا۔ گویا پتہ ڈال سے گر گیا۔ اور ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا ہوا کہیں دور فضا میں کھوگیا۔ موت کی وادیوں میں ہمیشہ کے لئے کھوگیا۔

مگر گل تو چلا گیا ہے ہمیشہ کے لئے۔ وہ اب واپس نہیں آئے گا۔

خوب چند نے لاچی کی طرف مڑے بغیر کہا۔ جیسے وہ لاچی سے نہیں تصویر سے پوچھ رہا ہو۔

وہ نہ آئے گا تو کیا ہوا میں تو اس کے پاس جا سکتی ہوں۔ میں تو خانہ بدوش ہوں سپری مان۔ میرے لئے تو کوئی مکان نہیں ہے کوئی دیس نہیں ہے۔ کوئی دیوار نہیں ہے اور کوئی جیل نہیں۔ میں ہر کہیں جا سکتی ہوں۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ میں تو خود اکیلی پیدل چل کے بھی گل کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ چاہے وہ یہاں سے ہزاروں میل دور کیوں نہ رہتا ہو۔

میں نے سوچا تھا۔ خوب چند نے کہا۔ اور پھر رک گیا۔

کیا سوچا تھا۔

سوچا تھا یہ نوکری چھوڑ دوں گا۔ تمھیں لے کر پیرس چلا جاؤں گا اور وہاں ایک اسٹوڈیو کھول کر صرف تمھاری تصویریں بنایا کروں گا۔

صرف میری کیوں۔

کبھی کبھی ایک شخصیت ایک سمندر کے برابر ہو جاتی ہے۔

میں نہیں سمجھی: لاچی نے حیران ہو کر کہا۔

خوب چند اس کی طرف مُڑا۔ بولا یہ تو نہیں ہے کہ تم نے کچھ سُنا نہ ہو۔ اور کچھ سمجھا نہ ہو آخر میرے نہ کہنے پر جب تُم نے اتنا کچھ سمجھ لیا تو اتنی سی بات بھی کیوں نہ سمجھ سکو گی۔ اگر خود ہی نہ سمجھو تو میرے کہنے سے کیسے سمجھ سکو گی۔

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ روح کی بات روح سمجھ لیتی ہے لیکن کوئی روح دوسری روح میں اتنی ڈوب نہیں سکتی کہ اس کے غم کو اپنا غم بنالے۔ ہائے کتنی بُری تنہائی ہے۔

لاچی بولی۔ تم ہمیشہ یا تو کچھ ثابت کرتے رہتے ہو۔ یا تصویر بناتے ہو۔ اور میں صرف چاہتی ہوں سُپری ٹان۔ کیا صرف چاہنا کافی نہیں ہے۔

خوب چند نے لاچی کی طرف ایک قدم بڑھایا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا تھا کہ لاچی کو اپنے بازوؤں میں لے لے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ رُک گیا۔ اس نے اپنے بازو بڑی سختی سے اپنے سینے کے گرد لپیٹ لیئے۔ بولا کبھی کبھی چاہنا تو کیا کسی کے لیے مر جانا بھی کافی ہوتا ہے۔

ہائے تم نے کتنی اچھی بات کہی ہے۔ لاچی نے تعریفی نگاہوں سے خوب چند کی طرف دیکھ کر کہا۔

بس یہی بات میں گُل کے لیے ہمیشہ سوچتی تھی۔ مگر بیان نہیں کر سکتی تھی۔

خوب چند خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ لاچی رُخ پھیر کر تصویر کو دیکھنے لگی۔ بولی تم اس تصویر کا کیا کرو گے۔

میں اسے اپنے ساتھ پیرس لے جاؤں گا۔

اور یکا یک خوب چند کو احساس ہوا جیسے اسے اس وقت کچھ کرنا چاہیئے۔ یا تو لاچی سے جھگڑا کر کے اسے کمرے سے باہر بھیج دینا چاہیئے۔ یا زبردستی اپنے گلے سے لگا لینا چاہیئے

یا اپنے سر کے بالوں کو نوچ لینا چاہیے۔ ورنہ یہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہوا اضطراب اسے پاگل بنا دے گا۔
خوب چند نے ایک چھوٹی سی الماری میں کنجی لگائی۔ اور اس میں سے خوشبو کی دو تین چھوٹی چھوٹی بوتلیں نکالیں اور انھیں تصویر پر لگانے لگا۔ بالوں پر رات کی رانی گردن پر جوہی۔ گھاگھرے پر گلاب!

کیا کر رہے ہو۔ لاچی نے حیرت سے پوچھا۔

تصویر کو خوشبو لگا رہا ہوں۔

لاچی نے کہا۔ بڑے عجیب آدمی ہو۔ خوشبو تو پیرس جاتے جاتے اُڑ جائے گی۔

مگر یاد تو باقی رہ جائے گی۔ خوب چند لاچی کی طرف مڑا اور بولا۔ لاچی کبھی کوئی چیز ختم نہیں ہوتی۔ کسی دوسری چیز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ خوب صورتی یاد ہیں۔ یاد نغمے ہیں نغمہ گونج ہیں۔ گونج فضا میں فضا لہروں میں اور لہروں کو کون مٹا سکتا ہے؟

لاچی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ بولی۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ مجھے اس وقت گل یاد آ رہا ہے!

گل! گل!! گل۔ یکایک خوب چند چیخا۔ یہ وقت گل۔ گٹ آؤٹ مگر یہ ری ٹان!
لاچی اُسے یوں بہکتے دیکھ کر گھبرا گئی۔

گٹ آؤٹ۔ خوب چند دونوں ہاتھ پھیلا کر پھر چیخا۔

لاچی دوڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ راستے میں اسے دو تین ہیجڑا سی دوڑتے ہوئے خوب چند کے کمرے کی طرف آتے ہوئے ملے۔ ایک ہیجڑا سی نے پوچھا۔ کیا ہوا۔

لاچی بہت تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ کیا ہوتا۔ تم ہی بتاؤ۔ جب کوئی مرد کسی عورت کو چاہتا ہے اور وہ عورت اسے نہیں چاہتی تو کیا ہوتا ہے۔

دل آرا نے پوچھا۔ کیا ہوا۔

وہ مجھ کو پیرس لے جانا چاہتا ہے مگر ہر مرد صرف اپنے چاہنے کو چاہتا ہے وہ نہیں دیکھتا کہ عورت کیا چاہتی ہے۔

ہائے پیرس!

کوشلیا کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس کی آنکھیں اشتیاق سے چمکنے لگیں۔ اسے بولو مجھے پیرس لے چلے۔

دوسری عورتیں ہنسنے لگیں۔ لیکن لاچی کو ہنسی نہ آئی۔ وہ سر جھکا کر اپنے گوشۂ تنہائی میں چلی گئی۔

تین روز تک لاچی اپنے بارک سے باہر نہ نکلی۔ وہ تین روز سے بخار میں بھنتی رہی۔ تین روز تک ڈاکٹر اسے آکے دیکھتا رہا اور دوا دیتا رہا۔ لیکن بے سود۔ لاچی کا بخار بڑھتا ہی گیا۔ پانچویں روز ڈاکٹر بہت سنجیدہ اور متفکر سا چہرہ بنائے ہوئے لاچی کے بارک سے باہر نکلا۔ وارڈرن اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ باہر جیناں بائی۔ کالی چرن اور خوب چند کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نے ان لوگوں کی سوالیہ نگاہوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

حالت خطرناک ہے اسے فوراً ہسپتال میں بھیجنا ہوگا۔

جیل کے ہسپتال میں خوب چند نے پوچھا۔

نہیں! ڈاکٹر بولا۔ اسے چھوت کی بیماریوں کے ہسپتال میں بھیجنا ہوگا۔

چھوت کی امراض کے ہسپتال میں کس لئے۔ خوب چند نے گھبرا کے پوچھا۔

اُس کے چیچک نکل آئی ہے۔

ہسپتال کی دُنیا ایک تاریک اور مہیب دُنیا تھی۔ وہ ہذیانی دنوں اور بیہوش راتوں کی دُنیا تھی لاوے کی طرح کھولتے ہوئے دماغ اور آگ کی طرح جلتے ہوئے اور پیپ کی طرح رستے ہوئے زخموں کی دُنیا تھی۔ ارے کتنے بڑے گڑھے تھے اس میں جیسے وہ قدم قدم پر پیپ اور لہو لاوے اور کیچڑ میں دھنستی چلی جا رہی ہو۔ اور اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اور وہ چیخ چیخ کر گُل کو پکارتی اور جب وہ چیختی تو اندھیرے میں کہیں کہیں بجلی کوندتی۔ کہیں کہیں سیاہ گرجتے ہوئے بادل پھٹتے ہوئے نظر آتے اور گرے آفاق کے سراسیمہ ہیولوں میں اسے کبھی گُل کبھی کالی چرن کبھی خوب چند کی پرچھائیاں نظر آتیں۔ اور نظر آتے ہی اوجھل ہو جاتیں۔ آنکھوں کے پٹ کھول کھول کر اپنی خانہ بدوش

ماں اور باپ کو آواز دیتی ۔ روح کی پوری طاقت سے اپنے قبیلے کو پکارتی اور خدا کو پکارتی جو سات زمینوں اور سات آسمانوں سے پرے کسی غیر مرئی دُنیا میں کھڑا اس پر ہنس رہا تھا ۔ وہ غم اور غصّے سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے چالیتی تو ادھ پکے اور پیپ ملے لہو کی دھار دن سے اس کا منھ بھر جاتا اور وہ غوں غوں کرکے بے ہوش ہو جاتی ۔ یوں بھی اسے ہوش کم آتا ۔ یا تو مکمل بے ہوشی ہوتی تھی یا نیم بے ہوشی ۔ چیچک اور بخار اس کے جسم کے خلیوں میں یوں چل رہے تھے جیسے تیز رفتار آندھی بادلوں کو لئے ہوئے گرد و غبار اُڑاتی ہوئی ۔ درختوں کو جھکاتی ہوئی چھپروں کو توڑتی ہوئی انسانی بستیاں اُجاڑتی ہوئی چاروں طرف تباہی مچاتی ہوئی ۔ اس کے خوب صورت جسم و جاں کو اپنے پاؤں تلے روندتی ہوئی گزر رہی ہو اک قعرِ فنا تھا جس میں وہ گرتی جارہی تھی ۔ ایک گرداب مسلسل تھا جس میں وہ غوطے کھا کر ایک حقیر بے بضاعت بے جان تنکے کی طرح گردش کر رہی تھی ۔ آسمان سر پر ٹوٹ پڑا تھا زمین پاؤں کے نیچے سے پھٹ گئی تھی ۔ لال اودی نارنجی روشنیاں پھلجھڑیاں ۔ ستارے ۔ تارے ۔ رے ۔ سے رہتے سیتے ۔ کیچڑ .... کائی ۔ جھیل جھیل جھیل جل جل کرتی جونکیں ۔ کلبلاتے ہوئے کیڑے اس کے جسم پر رینگ رہے تھے ۔ بچالو ۔ مجھے بچالو ۔ دیکھو یہ میری آنکھوں میں اُبل رہا ہے ۔ یہ آگ میری ہڈیوں کو جلا رہی ہے یہ کانٹوں کی طرح تیز زبان رکھنے والے کیڑے میرے جسم میں گھسے جارہے ہیں ۔ جھاڑیاں ۔ جنگل ۔ تلوے ۔ کانٹے ۔ آبلے ۔ ریت میں ریت ہی ریت کھیت ، کھیت ، جھیت ، چرخ چرخ میں ٹوٹی میں گری ۔ میں ڈوبی ۔ بچاؤ ۔ بچاؤ ۔

جب ۲۷ دن کے ہذیانی بخار کے بعد طوفان تھما ۔ آندھی رُکی اور لاوا منجمد ہوا تو لاچی نے ایک گہری اور بسیط تاریکی میں آنکھیں کھولیں ۔ اب وہ ہمیشہ کے لئے اندھی ہو چکی تھی ۔ اور اس کی حسن اور بد نما ہڈیوں کے ڈھانچے پر منڈھی ۔ مرجھائی ہوئی کھال پر اتنے بڑے بڑے تاریک گڑھے تھے جیسے کسی نے اس کے حُسن کے نیچے بارود رکھ کے فلیتے سے اُڑا دیا ہو ۔

مزید تین ماہ کے بعد لاچی کو ہسپتال سے واپس جیل بھیجا گیا ایک بار پھر لاچی کی جانکی

سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر میں ہوئی۔ اسے کمرے میں لایا گیا جہاں جیل میں آنے سے پہلے روز لائی گئی تھی۔ جیل کے بہت سے لوگوں کو لاچی کو دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ حاجی اور میر چنداتی۔ کوشلیا اور جیناں۔ کافی چرن اور دوسرے لوگ۔ صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ لاچی کے حسن کے ساتھ چیچک نے کیا سلوک کیا ہے۔ انہیں ہسپتال سے وقتاً فوقتاً جو رپورٹیں ملتی رہتیں تھیں ان پر انہیں کامل اعتبار نہ تھا۔ کیوں کہ انھوں نے لاچی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جو تصویر اپنی نظر سے دل میں اتر جاتی ہے وہ اس وقت تک نہیں مٹتی جب تک انسان پھر اپنی آنکھوں سے تبدیلی کا مشاہدہ نہ کرے۔ سب اسے دیکھنا چاہتے تھے مگر خوب چند تھا جو اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اس نے یہ انتظام ضرور کر لیا تھا کہ جب لاچی اس کے کمرے میں لائی جائے اس وقت وہ تنہا ہو۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسری کو اپنے ردعمل سے آگاہ ہونے دے۔ جب خوب چند نے اشارہ کیا تو جو لوگ لاچی کو خوب چند کے کمرے میں لائے تھے اسے اکیلی چھوڑ کر باہر چلے گئے۔

جب لاچی اندر آئی تو خوب چند کا ہاتھ بے اختیار اپنی آنکھوں پر چلا گیا جیسے وہ آنکھیں یہ منظر دیکھنا نہ چاہتی ہوں۔ لیکن وہ اس ملاقات کے دوران میں پورے وقت اپنی آنکھیں بند کئے نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے لاچی کو دیکھنا پڑا۔ اور پہلی ہی نگاہ میں لاچی کی بدصورتی ایک برچھی کی طرح اس کے دل میں اتر گئی۔ کہاں تھی وہ متاع بے بہا جسے لے کر وہ پیرس جا رہا تھا۔ وہ پھول کی طرح شگفتہ اور زندگی کی طرح شاداب حسن جس کی تصویر مہینوں کی محنت شاقہ کے بعد اس نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ کیا یہی وہ لاچی ہے جس نے اس کے جذبات میں ہلچل مچا دی تھی۔ جس کے تخیل نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ جس کے پائے ناز پر سر رکھ دینے کے لئے وہ بے قرار ہو اٹھا تھا یہ بدہیئت بدنما جسم۔ یہ خوفناک چہرہ۔ پھٹے ہوئے ہونٹ مڑی تھوڑی بیٹھی ہوئی ناک اور تاریک گڑھوں میں چمکتی بے نور سپید سپید آنکھیں۔ کیا یہ وہ لاچی ہے میرے خدا۔

سپری تمان۔ لاچی آہستہ سے بولی۔ مجھ سے بات نہیں کرو گے۔

نہیں لاچی۔ خوب چند گھبرایا ہوا بولا۔ یہ بات نہیں ہے مجھے دھچکا سا لگا ہے۔۔۔۔

میں بہت بدصورت ہوگئی ہوں۔

لاچی نے خوب چند سے پوچھا۔

وہ اس سوال سے اور بھی گھبرا گیا۔

فوراً انکار کرتے ہوئے بولا۔ نہیں نہیں لاچی یہ بات نہیں ہے تم اس کرسی پہ بیٹھو۔ خوب چند نے ہاتھ کا سہارا دے کر لاچی کو کرسی پہ بٹھانا چاہا۔ لیکن لاچی نہیں بیٹھی۔ بولی۔ میں تمہاری قیدی ہوں مُپھری مان میں تمہارے سامنے کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔

ہسپتال میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ خوب چند جلدی جلدی سے بولنے لگا۔ میں تمہیں خود دیکھنے کے لئے آنا چاہتا تھا۔ لیکن ادھر جیل میں کام بکلفت اتنا بڑھ گیا کہ مجھے پل بھر کے لئے بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ لیکن دل میں ہمیشہ یاد کرتا تھا۔ یہاں جیل میں ہر شخص تمہارے اعلیٰ اخلاق اونچے کردار اور بلند سیرت۔

سپری مان۔ لاچی نے خوب چند کی ان سطحی باتوں کو بیچ ہی سے کاٹ دیا۔ کیونکہ آخر ان باتوں کا مطلب ہی کیا تھا۔

ہاں لاچی۔

مجھے پیرس لے چلوگے۔

پیرس۔ اوہ۔ پیرس۔ ہاہاہا۔ خوب چند کھسیانی ہنسی ہنسا۔

ہاں۔ اور صرف میری تصویر بنایا کروگے نا؟ کیونکہ کبھی کبھی ایک شخصیت ایک سمندر ہو جاتی ہے اور میں بھی تو ایک سمندر ہوں۔ کیا ہوا اگر مجھ میں تھوڑا سا کوڑا کرکٹ آن ملا ہے سمندر میں تو سینکڑوں ہزاروں ٹن انسانی غلاظت دریاؤں کے ذریعے آکر گھل جاتی ہے۔ ہے نا۔

لاچی کی آواز میں شدید تلخی تھی۔

اے۔ اے۔ لاچی! سنو لاچی تمہارے لئے ایک خوش خبری ہے۔

یکایک لاچی کا دل بیٹھنے لگا۔

گُل واپس آگیا ہے ضرور گُل واپس آگیا ہے۔

لاچی کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اب وہ کھڑی نہ رہ سکی تھی کُرسی کے بازو کا سہارا لے کر یکا یک وہ بیٹھ گئی۔ اور بہت کمزور آواز میں بولی۔ گُل واپس آگیا ہے۔ اس کی چٹھی آئی ہے۔

نہیں۔ خوب چند نے میز کی دراز سے ایک فائل نکالتے ہوئے کہا۔ اور یہ خوشخبری سُن کر جیسے لاچی کی رُکی ہوئی سانس کی آمد رفت پھر سے شروع ہوگئی۔ رگوں میں پھر خون دوڑنے لگا۔ اور وہ خوف اور وحشت جس نے گویا اس کے گلے کو پکڑ لیا تھا۔ آپ ہی آپ کہیں زائل ہو گئے۔

گورنمنٹ نے میری سفارش پر تمہارے اعلیٰ چال چلن اور تمہارے جیل کے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے تمہاری باقی سزا معاف کر دی ہے آج سے تم آزاد ہو۔ جہاں جا سکتی ہو۔

جہاں چاہے جا سکتی ہوں۔ یہ الفاظ تیر کی طرح لاچی کے سینے میں پیوست ہو گئے۔ کبھی اس نے سوچا تھا جیل سے آزاد ہو کر وہ اپنے گُل کے مُلک میں جائے گی۔ اور اسے ڈھونڈے گی پیدل چل کر۔ منزل منزل ٹھہر کر ایک دن وہ گوہر مقصود کو پالے گی۔ لیکن جب تو اس کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھیں جو کروڑوں انسانوں کے چہرے میں اپنے محبوب کا چہرہ تلاش کر سکتی تھیں۔ اب وہ وسیع۔ بے کنار تاریکی کی پہنائیوں میں کھو کر کس طرح اپنے گُل کو ڈھونڈ سکتی ہے۔ قدرت اس سے سب کچھ لے لیتی لیکن آنکھیں تو رہنے دیتی۔ آنکھیں جو محبوب کو دیکھنے کے لئے ہوتی ہے۔

اب تم کہاں جاؤ گی لاچی۔ خوب چند نے سوال کیا۔ اور لاچی کے خیال کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

لاچی نے اپنے آپ سے پُوچھا۔ اب تو کہاں جائے گی لاچی۔ یہ جیل کی چہار دیواری جو چند ماہ کے لئے ایک بے کس اندھی کے لئے جائے پناہ ثابت ہوتی وہ بھی ان لوگوں نے تجھ سے چھین لی۔ اب تو کہاں جائے گی۔ جس کے لئے تو نے قبیلہ چھوڑا اور جس کے لئے قبیلے نے تجھے چھوڑ دیا وہ بھی یہاں موجود نہیں ہے۔ پھر ڈھونڈ لے۔ یہ دُنیا تو بہت بڑی ہے۔ کہیں نہ کہیں تجھے بھی سہارا مل جائے گا۔ خیال دوڑا لے چاروں طرف۔ کیا تیرا یہاں کوئی نہیں ہے۔

لاچی نے اپنے ذہن میں چاروں طرف خیال دوڑایا۔ لیکن وہ اندھی ہو چکی تھی کچھ نہ دیکھ

سکی۔ پھر وہ آہستہ سے بولی ۔ مجھے جیل خانے کے باہر چھوڑ دو ۔ جہاں جانا ہوگا خود چلی جاؤں گی۔

خوب چند نے جلدی سے گھنٹی بجائی ۔ ایک ملازم اندر آیا ۔ خوب چند نے کہا ۔ لاچی کو کالی چرن صاحب کے دفتر میں لے جاؤ ۔ وہ تمام ضروری کاغذات دیکھ کر اسے رہا کر دیں گے ۔

ملازم لاچی کو سہارا دے کر خوب چند کے دفتر سے باہر لے گیا ۔ خوب چند رومال سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا ۔ دل ہی دل میں وہ خدا کا شکر بجالایا ۔ زیادہ تلخ کلامی بھی نہیں ہوئی اور معاملہ آسانی سے حل گیا ۔

کالی چرن کا دفتر لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ۔ جیل کی تین چار عورتیں جیناں بائی میر چندانی حاجی عبدالسلام بھی موجود تھے ۔ اور حیرت ، تاسف ، ہمدردی اور استہزا کے ملے جلے جذبات سے لاچی کو دیکھ رہے تھے ۔ لیکن سب دم بخود اور خاموش تھے ۔ لاچی کی خوب صورتی نے جس طرح ان کے جذبات کو برانگیختہ کیا تھا ۔ اس کی بدصورتی نے اسی طرح اُن کے جذبات کو یخ بستہ کر دیا ۔ اگر اس وقت وہ یہ سوچتے تھے کہ ایسی خوب صورتی ممکن نہیں ہے تو اس وقت ان کا خیال تھا کہ ایسی بدصورتی کیسے ممکن ہو سکتی ہے ۔

کالی چرن نے تمام ضروری کاغذات پر لاچی کا انگوٹھا لگوایا ۔ اب اس کی رہائی کا وقت آ گیا تھا ۔ لاچی بولی ۔ حاجی جی یہاں ہیں ۔

ہاں موجود ہیں ۔ کالی چرن بولا ۔

اور میر چندانی ۔ وہ بھی ہیں ۔ کیوں

کالی چرن نے پوچھا ۔ لاچی نے کہا ۔ ایک بار ان لوگوں نے جیناں بائی کے ذریعے مجھے پیغام بھجوایا تھا کہ وہ میری آبرو لینے کے عوض پچاس ہزار روپیہ دیں گے ۔ میں بدصورت ضرور ہو چکی ہوں ۔ لیکن میری آبرو سلامت ہے ۔ دفتر میں سناٹا چھا گیا ۔ لاچی نے اپنی اندھی آنکھیں جھپکائیں اور حاجی اور میر چندانی کی طرف مڑ کر بولی ۔

آج بولی ہو جائے ۔ آؤ آج لاچی کی آبرو کو نیلام کریں بولو حاجی ۔ بولو میر چندانی ۔ پچاس ہزار

دینے والو آج پانچ روپے ایک ..... پانچ روپے ایک ..... پانچ روپے ..... ایں کیا آج کوئی بھی بولی نہ دے گا۔

سب خاموش بیٹھے رہے۔

لاچی زور زور سے ہنسنے لگی۔ زہریلی ہنسی کا ایک ریلا سا تھا جس سے اس کا دُبلا پتلا مریل سا جسم لرز لرز جاتا تھا۔

سب خاموش رہے۔ کالی چرن نے اشارہ کیا۔ اور دو وارڈرن اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جیل سے باہر چھوڑ آئے۔

باہر کی دُنیا بھی اتنی تاریک تھی جتنی جیل کی کے اندر کی دُنیا۔ دراصل لاچی ابھی اپنے اندھے پن سے اچھی طرح مانوس نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ جیل سے باہر نکلی تو اس کی آنکھیں بے اختیار آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نیلا آسمان دیکھے گی۔ روشن چمک دار دھوپ دیکھے گی سفید سفید بادلوں کو پاکیزہ آرزوؤں کی طرح لہلہاتے ہوئے دیکھے گی۔ اسے لوگ نظر آئیں گے۔ موٹریں۔ سڑک کے کھمبے خوب صورت ساڑیوں۔ دلکش بچے۔ رنگین غبارے اُڑاتے ہوئے۔ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے۔ خوشی کی دھومیں مچاتے ہوئے۔ ایک لمحے کے لئے جیل سے باہر نکلتے ہوئے اس کے دل میں یہ تمام تصویریں آئی تھیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں جب اس نے آسمان کو تاریک دیکھا اور زمین سیاہ اور افق سے افق تک ایک گہری دبیز چادر تنی ہوئی نظر آئی تو اس کے صبر کے بند ٹوٹ گئے۔ اور وہ وہیں جیل کے باہر فٹ پاتھ پر گر گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ زمین کی مٹی اس کی آنکھوں میں تھی۔ اس کے ہونٹوں میں تھی اس کی اندھی آنکھوں میں عجز اور اس کے بے قرار دل کا لہو آنسوؤں کی صورت میں بہہ بہہ کر دھرتی میں جذب ہو رہا تھا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ آنسو صرف آنسو ہے پانی نہیں ہے۔ پانی سے دھرتی میں چھپا ہوا بیج پھوٹ کر اُبھر آتا ہے۔ لیکن آنسو سے دل کا غم بھی نہیں اُبھرتا۔ ورنہ آج اس سطح زمین پر جگہ جگہ غم کے پودے اُگتے۔ اور پتے پتے پر انسان کے ظلم کی دہائی دیتے۔

سترہواں باب

اسٹیشن یارڈ میں ہنگامہ تھا۔

رسک لال اپنی ڈھیلی پگڑی سنبھالتا ہوا ادھر سے اُدھر دوڑ رہا تھا۔ اسٹیشن سے آگے لائن خراب ہو چکی تھی۔ اس لئے فرنٹیر میل دہلی سے آتے ہوئے اسی اسٹیشن پر چند گھنٹوں کے لئے رُکنے والی تھی۔ آج تک فرنٹیر میل ایسی عظیم الشان گاڑی کبھی اس اسٹیشن پر رُکی نہ تھی۔

رسک لال بہت خوش تھا۔ اور کچھ گھبرایا ہوا بھی تھا۔ اور قُلی۔ کانٹے والے۔ سگنل مین یارڈ مستری سب لوگوں کی شامت بُلائے ہوئے تھا۔ ایسا معلوم تھا کہ فرنٹیر میل نہیں۔ گورنر صاحب اسٹیشن پر قیام کرنے کی غرض سے آرہے ہیں۔

اسٹیشن سے باہر مادھو فروٹ والا اور حمید ٹیکسی والوں کا سرغنہ بھی بے حد خوش تھے۔ آج گاہکی بڑھ گئی۔ اس لئے فروٹ اور ٹیکسی دونوں کے دام بھی بڑھ جائیں گے۔ پرائیویٹ ٹیکسیوں تک کا دھندا چمک جائے گا کیونکہ بہت سے لوگ اتنی دیر تک فرنٹیر میل کے رُکے رہنے کا انتظار نہ کریں گے۔ اور یہیں سے ٹیکسی لے کر اور بچوں کے لئے پھل خرید کر شہر کو چل دیں گے۔ مادھو لال جلدی جلدی سے پھلوں پر اپنا گندہ رومال گھس گھس کر اُن کو جُوتوں کی طرح چمکا رہا تھا۔ ٹیکسی والوں نے اسٹیشن کے باہر ایک طرف لائن لگا لی تھی۔ دوسری طرف کنکر بجری اور چھوٹے چھوٹے پتھروں کے ڈھیر کے پاس سڑک کوٹنے والا انجن بھی بھاپ نکال رہا تھا۔ سڑک کی مرمت

کی جا رہی تھی ۔ پان والے کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں آج دونوں کی سرد بازاری کی کسر پوری ہو جائے گی ۔

فرنٹیر میل آگئی ۔ اور چار نمبر کے پلیٹ فارم پر رُک بھی گئی ۔ لیکن ہنگامہ کچھ زیادہ نہیں ہوا ۔ اور مُسافر بھی بڑی تعداد میں نہیں اُترے ۔ کیوں کہ گاڑی کے رُکتے ہی خبر آگئی کہ آگے کا راستہ صاف ہو چکا ہے ۔ اس لئے گاڑی چند گھنٹے رُکنے کی بجائے صرف چند منٹ رُکے گی ۔ اس لئے جن مُسافروں نے یہاں سے اُتر کر ٹیکسی لے کر شہر جانے کا پروگرام بنایا تھا انھوں نے جب پلیٹ فارم کے لاؤڈ اسپیکر سے یہ خوشگوار خبر سُنی تو اُترنے کا ارادہ ملتوی کر کے گاڑی میں بیٹھے رہے ۔ اور قلی اور پان والے ۔ فروٹ والے ٹیکسی والے اور پرائیویٹ گاڑی والے سب کے سب ناامید ہو کر اپنا سا مُنھ لے کر رہ گئے ۔

دھت تیرے کی ! آج اپنا لک ہی خراب ہے ۔ حمید ٹیکسی والے نے ریل کی پٹری پر پان کی پیک زور کی ڈالتے ہوئے کہا ۔

گاڑی سے چند ہی مسافر اُترے ۔ اُن میں سے ایک گُل بھی تھا ۔ حمید نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا ۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے بڑے زور سے مصافحہ کیا ۔

میں نے سمجھا تم پاکستان چلے گئے ہو ۔ بہت عرصے سے تمھیں نہیں دیکھا ۔

والد تو پاکستان چلے گئے ۔ مگر میں دہلی میں تھا ۔ اور اتنے عرصے سے یہی کوشش کر رہا تھا کہ یہاں کی شہریت مل جائے ۔

تو کیا ہوا ۔ کچھ کامیابی کی صُورت نظر آئی ۔

ہاں ۔ گُل نے خوش ہو کر کہا ۔ مجھے یہاں کی شہریت مل گئی ہے ۔

لاچی کا کیا حال ہے ۔

مجھے کیا معلوم ۔ گُل بولا ۔ دہلی سے میں نے تین چار خط جیل کے پتے پر لکھے تھے کسی کا جواب نہیں آیا ۔ اب کل جیل جاؤں گا تو اس سے ملوں گا ۔

اب سزا ختم ہونے والی ہے نا۔ حمیدا نے پُوچھا۔

ہاں۔ گُل خوش ہو کر بولا۔ صرف چار ماہ رہ گئے ہیں میرے حساب سے۔

دونوں باتیں کرتے کرتے ایرانی ریستوران کے قریب آ پہنچے تھے جس کا ایک دروازہ سٹیشن کے اندر تھا تو ایک کونٹر اسٹیشن کے باہر بھی تھا۔ جہاں سے اسٹیشن کے باہر کا تمام نظارہ دکھائی دیتا تھا۔

آؤ چائے پیو۔

گُل نے حمیدا سے کہا۔

نہیں۔ میں ذرا باہر جاتا ہوں۔ شاید کوئی گاہک مل جائے۔

حمیدا نے سر ہلا دیا۔ اور باہر چلا گیا۔

گُل نے ریستوران کے اندر بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا۔ اور اپنی شہریت کے کاغذات نکال کر ان کا غور سے مطالعہ کرنے لگا۔

اسٹیشن کے باہر سڑک پر ایک ہنگامہ ہو گیا تھا۔ اور لوگ باگ فرنٹیئر میل سے مایوس ہو کر اس دوسرے ہنگامے سے دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ بات بڑی معمولی تھی ایک اندھی بھکارن نے گالی خوشی سے قبول کرنے کے بجائے مُسافر کی بانہہ پکڑ لی تھی اور اس کے مُنہ پر دو گھونسے لگا کر اسے زمین پر گرا دیا تھا۔ ایسا واقعہ آج تک کسی نے دیکھا۔ سُنا نہ تھا۔ اس لئے سب لوگ بھکارن کے خلاف ہو گئے تھے اور پھر بھکارن تھی بھی عجیب اس کا سارا چہرہ چیچک کے گہرے داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی صُورت بے حد خوفناک ہو گئی تھی اور کپڑے میلے اور جگہ جگہ سے تار تار۔ وہ صورت شکل سے ایک ڈائن یا چڑیل سے کم نہ تھی۔

مالزادی پیسہ نہیں دیتے ہیں تو زبردستی کرتی ہے۔ گھونسا مارتی ہے۔

مگر تو نے مجھے گالی کیوں دی۔ لاچی زور سے چلائی۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ کئی مہینوں سے اس نے ادھر کا رُخ نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ شہر کے دوسرے حصّوں میں بھیک مانگ کر اپنی گزر

کرتی تھی۔ اس نے کبھی اس اسٹیشن کا رُخ نہیں کیا تھا۔ جہاں کسی زمانہ میں اس کا قبیلہ رہتا تھا۔ جہاں اس کے محبوب کا پُل تھا۔ جس کے اسٹیشن یارڈ کے چپے چپے پر اس کے حُسن و جمال کی داستانیں رقم تھیں۔ لیکن دل کو ہزار بار سمجھانے پر بھی وہ ادھر آنے سے نہ رُک سکی شاید اسے اپنے وطن کی مٹی بلا رہی تھی۔ ہاں یہی اسٹیشن یارڈ تو اس کا وطن تھا۔ شاید نہ آسودہ حسرتوں کی تمنا یا ماضی کے سپنے اُسے ادھر بلا لائے تھے۔ کچھ ہو آج وہ ادھر آ ہی گئی تھی۔ راستہ پُوچھتے پُوچھتے۔ پتھریلی بے رحم سڑکیں ٹٹولتے ٹٹولتے آج اپنے ماضی کی طرف پلٹ آئی تھی۔ شاید یہ دھرتی اسے پہچان جائے۔ شاید یہاں کسی بہتر سلوک کی آرزو جاگ جائے شاید! شاید؟ اسی لئے اسے اتنا غصہ آیا تھا۔ جب اسے مُسافر نے گالی دی تھی۔ وہ اسٹیشن یارڈ کی ملکہ تھی۔ اس علاقے کی رانی۔ جہاں پر اس کے قدم پڑتے تھے وہاں پر اس علاقے کی مخلوق آنکھیں بچھاتی تھی۔ اس نے اس مُسافر کو بتا دیا کہ وہ ابھی تک وہی لاچی ہے۔

اُس نے مُسافر کی گالی سُن کر اسی وقت اس کا بازو پکڑ کر دو طمانچے رسید کر دیئے تھے۔ غم اور غصے سے اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

پھر کسی نے اس کی چھڑی اس کے ہاتھ سے چھین لی اور ایک زور کا تھپڑ مار کر بولا۔

حرامزادی! ایک تو بھیک مانگتی ہے اُوپر سے شریف آدمیوں پر ہاتھ اُٹھاتی ہے۔

لاچی نے آواز پہچان لی۔ یہ حمیدا ٹیکسی والا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ دم بخود ہو کر رہ گئی۔ پھر غم اور غصے کا جدید ایک سیلاب کی طرح اُمڈ آیا۔ وہ بپھر کر بولی۔ اندھی جان کے میری بے عزتی کرتا ہے۔ میرے نزدیک تو آ تیری ہڈی پسلی ایک کر دوں گی۔ جانتا ہے میں کون ہوں۔ لاچی زور سے چلائی۔

شیطان کی خالہ۔ بدذات چڑیل ہے۔ قبرستان کی ڈائن ہے اور کون ہے تو ..... بہت آتی ہیں تجھ جیسی یہاں اڈے پر بھیک مانگنے والیاں۔

حمیدا نے غصے سے کہا۔

پھر اس نے لاچی کی چھڑی سے ایک اور بھرپور وار اس کی پیٹھ پر کیا۔ لاچی تڑپی۔

تلملائی۔ چکرائی اس کے بازو عمیدا کو ٹٹولتے ہوئے چاروں طرف بڑی بے بسی سے گھومے۔ اس کی اُن حرکات کو دیکھ کر سکول سے آتے ہوئے بچے ہنسنے لگے۔ چند بچوں نے سڑک پر پڑے ہوئے پتھروں کے ڈھیر سے پتھر اُٹھا لئے۔ اور اندھی کو مارنے لگے۔ مارو! مارو!! چند لڑکے خوشی سے چلائے۔

وہ مُسافر جسے لاچی نے گھونسا مار کے گرایا تھا۔ اس نے بھی ایک پتھر مارا۔ لاچی کے ماتھے سے خون نکل آیا۔ وہ لڑکھڑا کر بھاگنے لگی۔ لوگوں کے مجمع نے اسے دوسری طرف دھکیل دیا۔ مادھو پھل والے نے پتھر مار کے غصّے سے کہا۔

مارو۔ مارو۔ پتھر لاچی کے شانے پر جا لگا۔ لاچی نے مادھو کی آواز پہچان لی۔ دل ہی دل میں بولی۔ یہ مادھو ہے۔ مارو۔ مارو۔ سالی کو! پان والے نے پتھر اُٹھایا۔ یہ سکھیا پان والا ہے۔ لاچی نے اپنے دل میں کہا۔

لاچی اب زمین پر گر چکی تھی۔ اور اس کے چاروں طرف سے پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔ اور زمین کے سینے سے لپٹی ہوئی تھی۔ اور پتھر اس کے جسم کو چھلنی کر رہے تھے۔ یکایک مجمع چھٹتا ہوا معلوم ہوا۔ لوگ تتر بتر ہو کر بھاگ گئے۔ پولیس والوں کے قدموں کی آواز قریب آتی گئی۔ پھر کسی نے دونوں بازوؤں سے اسے اُٹھا لیا۔ اور اسے لے کر ایرانی ریستوران کی طرف دوڑا۔ دو میزیں جوڑ کر اسے لٹا دیا۔ اور کسی نے بھاری آواز میں کہا۔

پانی لاؤ۔ پانی لاؤ۔

یکایک لاچی چونکی۔ یہ گُل کی آواز تھی۔ جو اس کے رگ و ریشے میں سمائی جا رہی تھی۔ یہ گُل کے ہاتھ تھے جو اس کے چہرے کے زخموں کو دھو رہے تھے۔ یہ ابرِ رحمت کے قطرے تھے جو اس کی اندھی آنکھوں کو ایک مستور بینائی بخش رہے تھے۔ یہ تو میرا گُل ہے یہ تو میرا گُل ہے۔

کیا ہوا ۔ ایک پولیس والے نے گُل سے پُوچھا۔

مجھے خود معلوم نہیں ۔ میں یہاں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ شور سُن کر باہر گیا تو دیکھا لوگ اس کے پتھر مار رہے تھے میں اُسے اُٹھا کر اُن لوگوں کے نرغے سے نکال کر یہاں لے آیا۔

اچھا کیا ۔

جب یہ ہوش میں آجائے گی تو تُم اس بےچاری کی رپورٹ ضرور درج کر لینا۔ سنتری جی !

سنتری زور سے ہنسا۔ اگر ایسے بھکاریوں کی رپورٹیں درج کرتے پھریں تو شہر کی پولیس کچھ اور کام ہی نہ کر سکے ! وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

[illegible]کے پاس فرسٹ ایڈ کا سامان تھا۔ گُل نے جلدی جلدی کسی طرح ان زخموں کی مرہم پٹی کی ۔ لیکن پھر بھی اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ضروری تھا۔ اور ڈاکٹر کی دکان اسٹیشن سے باہر پان والے کی دکان کے برابر واقع تھی۔ گُل نے اُس سے پُوچھا۔ کیا تو چل سکتی ہے ۔

لاچی نے آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا ۔ یہ بالکل سچ تھا ۔ وہ اپنے اندر ذرا بھی طاقت محسوس نہ کرتی تھی ۔ شاید وہ زخموں سے نڈھال ہو کر بھی وہاں سے چلی جاتی ۔ لیکن گُل کی آمد نے اس کی روح اور جسم کی ساری طاقت سلب کر لی تھی گُل نے اسے بازوؤں سے اُٹھا لیا ۔ اور ایرانی سے بولا۔

میں اسے ڈاکٹر کی دُکان تک لے جاتا ہوں ۔

لاچی نے جب سر گُل کے کندھے پر محسوس کیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسا رونا تو اسے آج تک نہ آیا تھا۔ ہر محرومی ۔ ہر یاس ۔ ہر حسرت ہر یاد دل کی گہرائیوں سے ایک جھرنے کی طرح پھوٹ نکلی تھی ۔

کاش انہی بازوؤں میں اس وقت اس کا دم نکل جائے تو کتنا اچھا ہو ۔ یہ تاریک رات کا سفر اگر اپنے محبوب کے بازوؤں میں کٹ جائے تو موت کتنی دلکش ہو جائے ۔ ارے میرے ظالم خدا ! میں تجھ سے اور کچھ نہیں مانگتی ۔ بس اس لمحہ میری جان لے لے ۔ مجھے اس کندھے پر ہمیشہ کے لئے سو جانے دو ۔

گل نے ڈاکٹر کی دکان کے اندر جاکر اسے سہارا دے کر بیڈ پر بٹھادیا۔ ڈاکٹر نے زخموں کا معائنہ کیا۔ زخم دیکھ کر کہا۔

زخم معمولی ہیں گہرے نہیں ہیں۔ ہفتے بھر میں ٹھیک ہو جائے گی۔ روز پٹی کے لئے آنا پڑے گا۔

اس کا نام۔ گل لاچی کی طرف مڑا۔ پوچھنے لگا۔ تمہارا نام۔

لاچی خاموش رہی۔ خاموش رہی۔ دل کا طوفان بڑھتا گیا.... بڑھتا گیا۔ قیامت کے شور سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ یہ گل کی آواز تھی کہ صور اسرافیل تھا۔ تمہارا نام! تمہارا نام! جیسے زمین اور آسمان کے دہانوں سے آتش فشاں لاوا پھٹ پڑا ہو۔ اور رعد کی آواز سے گرجتا ہوا لاچی کے چاروں طرف گھوم رہا ہو۔

ڈاکٹر صاحب تمہارا نام پوچھتے ہیں۔ گل نے پھر بڑی ملائمت سے کہا۔

میرا کوئی نام نہیں ہے۔

آج لاچی نے بڑی مشکل سے کہا۔

سچ کہتی ہے۔ ڈاکٹر نے جلدی جلدی سے پیڈ پر کچھ لکھتے ہوئے کہا۔ سڑک پر بھیک مانگنے والی ان اندھی بھکارنوں کا بھلا کیا نام ہوتا ہوگا۔

ایسا نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ گل نے مسکرا کر کہا۔

ان اندھی بھکارنوں کے بھی نام ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے اڈے بھی ہوتے ہیں جہاں یہ روز رات کو پہنچ جاتی ہیں۔ تم سچ کہتے ہو۔ لاچی نے اپنے دل سے کہا۔ کبھی میرا بھی ایک نام تھا۔ اور کبھی میرا بھی ایک گھر تھا۔ جہاں میں ہر روز اپنے خیالوں میں پہنچ جاتی تھی۔ رات کو بھی اور دن کو بھی۔ صبح کو بھی اور شام کو بھی۔ لیکن آج میرے خیالوں میں وہ رات آئی ہے جس کی کوئی صبح نہیں ہے۔ اب میں کہاں پہنچوں گی۔ اور کس کو آواز دوں گی۔ اور کس کو اپنا نام بتاؤں گی اور کس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گی۔ ڈاکٹر! ڈاکٹر کیوں اس نشتر سے میرے زخم کریدتے ہو۔ اسے

میرے دل میں چُبھو دونا۔ تاکہ زندگی کی ساری جلن ایک ہی لمحے میں ختم ہو جائے۔ ڈاکٹر نے پیڈ سے ورق پھاڑ کر گُل کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پانچ روپے اور اگر اگلے سات دن پٹی کرو گے تو سات روپے اور ہوں گے۔

گُل نے جیب سے بارہ روپے نکال کے ڈاکٹر کو دیئے۔ بولا یہ سات روپے کہاں سے لائے گی۔ یہ بھی میں ہی دیئے دیتا ہوں۔ پھر وہ لاچی کی طرف مُڑ کر بولا۔

روز پٹی کرانے آجایا کرو۔

بہت اچھا۔

لاچی بہت مدھم آواز میں بولی۔

گُل لاچی کو سہارا دے کر دکان سے باہر لایا۔

باہر لا کے بولا۔

کہو تو میں تمھیں تمھارے اڈے پر پہنچا دوں۔

نہیں میں خود ہی چلی جاؤں گی۔

گُل چُپ رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ تمھارا اڈہ کہاں ہے۔

میرا اڈہ۔ لاچی بولی۔ جہاں رات پڑ گئی وہیں اڈہ ہے بابو۔ تم نے بہت کر دیا۔ اب تُم جاؤ بابو۔ اپنے گھر جاؤ۔

یکا یک لاچی کا گلا بھر آیا۔ گُل اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے مُڑا اور سر جُھکا کر چلنے لگا۔

وہ جا رہا ہے۔ وہ جا رہا ہے وہ جا رہا ہے۔ وہ اب تجھے کبھی نہیں ملے گا۔ تو اُسے کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ کبھی چھو نہیں سکے گی۔ اس کی یاد میں بلک بلک کر مر جائے گی اور اسے کچھ معلوم نہ ہوگا۔ یکا یک لاچی لڑکھڑاتی ہوئی گُل کے قدموں کی آواز کی طرف دوڑی۔ اس نے اپنی دونوں بانہوں سے گُل کو پکڑ کر کہا۔ اور اس کے سینے سے اپنے چہرے کو چُھپاتی ہوئی بولی۔

گُل۔ ! گُل۔!! گُل !!! —— مجھے پہچانتے نہیں ہو میں لاچی ہوں —— !

اٹھارہواں باب

ملن کی رات آئی تھی۔ مگر کس کے لئے کتنی مہیب اور خوفناک۔ ڈر اور وحشت سے معمور۔ اور کسی کے لئے کیسی چمکدار اور درخشندہ۔ کائنات کی ساری خوشبوؤں سے بھرپور ایک ہی رات تھی۔ مگر دونوں کے لئے کتنی مختلف تھی۔ لاچی اطمینان کی ٹھنڈی سانس بھر کر گل کے سینے سے لگ کر سوگئی تھی۔ اور گل سوچ رہا تھا۔ یہ ایک رات میں دو راتیں کیسے ممکن ہیں۔ ایک تاریک اور سیاہ، گہری اور اتھاہ۔ بدہیبت اور بدبودار۔ غلاظت اور نجاست سے معمور۔ اور دوسری رات ستھرے ستھرے جذبات والی معصوم اور پاکیزہ رات جب کہکشاں مسکراتی ہے اور چاندنی سیل رواں بن کر بہتی ہے اور افق سے افق تک کسی کے ذہن میں ستاروں کے پھول کھل جاتے ہیں۔ اور محبت کی آغوش وا ہو جاتی ہے اور کوئی اطمینان کی گہری ٹھنڈی سانس لے کر اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دیتا ہے۔ ہاں ایک رات اور دوسری رات میں اتنا ہی فرق ہے جتنا نیکی اور بدی میں۔

لاچی گہری نیند سو رہی تھی۔ نیند میں اس کا چہرہ گوند والی ٹیپ کی صلیبوں سے پٹا ہوا چہرہ ایک مہیب قبرستان معلوم ہو رہا تھا۔ گل آہستہ سے بستر سے اٹھا۔ اور باہر بالکونی میں آگیا۔ رات خاموش تھی اور سیاہ۔ نہ چاند تھا نہ تارے۔ سیاہ بادلوں نے سارے آسمان کو اپنے تاریک غلاف میں ڈھانپ لیا تھا۔ گل نے آسمان کی طرف دیکھا۔ مگر وہ آسمان سے

کسی طرح کی مدد کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

گُل نے مایوس ہو کر اپنے دل کو ٹٹولا۔ اسے جذبے سے خالی پایا۔ محبت کی ساری ریت بہہ گئی تھی اور اس کے دل کی مُٹھی بالکل خالی ہو گئی تھی۔ وہ لاکھ اپنے دل کو سمجھاتا۔ مگر جب لاچی کی طرف دیکھتا۔ اسے ایک کراہیت آمیز متلی کا احساس ہونے لگتا۔ یہ وہ لاچی نہیں ہے جس سے اس نے محبت کی تھی۔ جس کی خاطر اس نے ساری دُنیا سے لڑائی مول لی تھی۔ جس کے لئے اس نے ملک اور کلچر۔ تہذیب اور عقل و دانش کی ساری دیواریں پھلانگ لی تھیں۔ وہ لاچی جو آج اس کی آغوش میں تھی وہ اس سے پیار نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے بازوؤں میں لپٹا نہیں سکتا تھا۔ اس کا وہ اعلیٰ وارفع و جگر کو گرمانے والا سانس روکنے والا شدید جذبہ آج کہاں غائب ہو گیا تھا۔ چاروں طرف برف تھی۔ برف ہی برف۔ جس جذبے کو ٹٹولو یخ بستہ۔ جس آرزو کو دیکھو برفیلی جس شوق کو چھوؤ خاکستر۔ حالاں کہ یہ وہی لاچی تھی۔ وہی اس کا بلند جذبہ تھا۔ وہی مکمل سپردگی اور اعتماد۔ اسے گُل کیا مل گیا گویا دُنیا کی تمام خوشیاں اسے حاصل ہو گئی تھیں۔

لیکن وہ خود ایک لق و دق صحرا میں اکیلا کھڑا تھا۔ اور چاروں طرف گھوم گھوم کر اپنے جذبے کو آواز دیتا تھا۔ لیکن کہیں سے پلٹ کر محبت کا کوئی بھی جذبہ اس کو پکارتا نہ تھا۔

رات تاریکی تھی۔ چاندہ جامد۔ مایوسی مکمل!

گُل نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بال نوچ لئے۔ لیکن وہ کسی طرح بھی کسی لطیف جذبے کو اپنے پاس بُلا نہ سکا۔

ڈاکٹر نے سات دن کے بعد لاچی کی پٹیاں کھول دیں۔ دس دن کے بعد لاچی چلنے پھرنے لگی تو لاچی سے گُل نے کہا۔ مجھے پُونا میں ایک نوکری مل گئی ہے۔ مجھے وہاں جانا ہوگا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ لاچی خوش ہو کر بولی وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں پہلے جا کر حاضری دے آؤں ایک مکان تمہارے لئے ڈھونڈ لوں آخر ایک چھوٹا سا گھر تو بسانا ہی ہوگا۔

ہلئے میرا گھر۔ لاچی خوشی سے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر بولی۔

کتنے دن لگ جائیں گے۔

تقریباً ایک ماہ لگ جائے گا۔

اور ایک ماہ میں یہاں اکیلی رہوں گی۔لاچی نے گھبرا کے پوچھا نہیں میں تمہارے بغیر اتنے دن کیسے رہ سکوں گی۔

بس ایک ماہ کی تو بات ہے۔ایک ماہ کے بعد میں بمبئی سے آ کر لے جاؤں گا۔ہو سکتا ہے اس سے پہلے ہی لے جاؤں۔ لینے کو تو ابھی ساتھ لیتا جاؤں۔ مگر تمہیں رکھوں گا کہاں۔ یہاں تو والد یہ گھر میرے قبضے میں چھوڑ گئے ہیں۔ یہاں ہر طرح کا آرام ہے میں لوگوں سے کہہ جاؤں گا۔تمہیں کسی طرح کی تکلیف کبھی نہ ہوگی خط بھی ہر ہفتے لکھتا رہونگا۔

لاچی راضی ہو گئی۔ گل سے رخصت ہو کر چلا گیا۔ چلتے وقت اسے پچاس روپے دے گیا اُوپر کے خرچ کے لئے۔ لاچی بہت خوش تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسرا ہفتہ گزر گیا۔تیسرا ہفتہ گزر گیا۔مگر گل کا خط نہ آیا۔ڈاکیہ آتا تھا اور لاچی کے کمرے کے سامنے سے گزر جاتا۔لاچی ہر روز ڈاکئے سے پوچھتی تھی اور ڈاکیہ ہر روز انکار میں جواب دیتا تھا۔پھر بھی لاچی ہر روز پوچھتی تھی۔

اس طرح ایک ہفتہ اور گزر گیا۔

پھر اس طرح دوسرا ہفتہ گزر گیا۔

نہ گل آیا نہ اس کا خط آیا۔

لاچی نے پچاس روپے بے حد سنبھال سنبھال کر خرچ کئے تھے۔لیکن آخر پچاس روپے ہی تو تھے۔ دو مہینوں میں ختم ہو گئے۔ چار چھ دن اُدھار سے کام چلا پھر لوگوں نے ادھار دینا بند کر دیا۔اب تین روز سے لاچی کے ہاں فاقہ تھا۔لوگ مُسکراتے تھے۔من چلے اس پر آوازیں کستے تھے۔ اندھی۔بے وقوف! گل کا انتظار کر رہی ہے جی ہاں۔وہ آئے گا۔ ضرور آئے گا۔بھلا اسے اس اندھی سے زیادہ خوب صورت لڑکی اس جہاں میں کہاں ملے گی۔

لاچی سب کچھ سُنتی۔ لیکن خاموش رہتی اُسے اپنے گل پر پورا بھروسہ تھا۔ اس کے دل میں تاریک سے تاریک وسوسے اُٹھتے تھے۔ پھر بھی وہ اپنی روح کی گہرائیوں سے گل کا ہاتھ پکڑ لیتی۔ اور پورے اعتماد سے اپنے دل کو سمجھاتی۔ گل آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ ضرور کوئی بات ہوگئی ہے۔ وہ بیمار پڑ گیا ہے۔ یا اسے نوکری نہیں ملی۔ مگر اس کو چاہئے تھا کہ مجھے خط تو لکھتا۔ دو سطر ہی کا خط لکھ دیتا۔ بس یہ خاموشی اچھی نہیں۔

ٹھیک دو ماہ دس روز کے بعد ڈاکیئے کے قدم لاچی کے کمرے کے سامنے آکر رُک گئے۔

اب چند دنوں سے لاچی نے پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ چُپ چاپ اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ اور خلا میں گھورتی رہتی تھی۔ ڈاکیئے نے بلند آواز میں کہا۔ لاچی! تمھارا منی آرڈر ہے۔ ایک لمحے کے لئے تو لاچی کے ہوش و حواس جواب دے گئے۔ دوسرے لمحے وہ دوڑتی ہوئی دروازے تک آئی۔ اور ڈاکیئے سے ٹکراتی بچی۔

گل کا منی آرڈر ہے۔

ہاں!

کہاں سے آیا ہے

پونا سے

کتنے کا منی آرڈر ہے

تیس روپے کا۔

اور کیا لکھا ہے

لکھا ہے ابھی مکان نہیں ملا۔ جب ملے گا آکر لے جاؤں گا۔

لیکا یک لاچی نے ڈاکیئے سے کہا کہ منی آرڈر واپس کر دو۔ منی آرڈر واپس کر دو۔ لاچی کمرے کے اندر گئی اور چھڑی اُٹھائی اور سڑک پر بھیک مانگنے کے لئے چلی گئی۔

اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی لاچی
دھیرے دھیرے غم کے بار سے سسکنے لگی۔
لاچی ایسی عجیب لڑکی تھی کہ جس ماحول میں
رہتی تھی اس سے الگ سوچتی تھی۔ لاچی ایسی
خوبصورت لڑکی تھی اگر وہ لڑکی نہ ہوتی تو سیب کا
پیڑ ہوتی۔ ہمالہ کی کنواری برف میں ڈھکی ہوئی
چوٹی ہوتی۔ یا زیرِ آب سمندر کی ریف میں
مستور کورل کا گلابی محل ہوتی۔ لیکن قدرت نے
اسے عورت بنایا تھا اور ماحول اور اتفاق نے اسے
خانہ بدوش بنادیا تھا۔ اور یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں
کہ کبھی انسان سے انصاف نہیں کرتیں۔
قدرت، ماحول، اتفاق ان تینوں چیزوں کے
زبردست ہاتھوں سے انصاف کو چھپنا پڑتا ہے۔

ASIA PUBLISHERS